تدبّرِ قرآن

۷

الاعراف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ انعام میں، جیسا کہ تفصیل سے واضح ہوا، قریش کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت اس بنیاد پر دی گئی ہے کہ یہی اصل ملتِ ابراہیمؑ ہے جس کی ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو تلقین کی نہ کہ وہ مجموعۂ بدعات واوہام جو تم لیے بیٹھے ہو۔ اللہ نے تم پر بڑا فضل فرمایا ہے کہ اس نے تمہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جس نے اللہ کی حجت تم پر پوری کر دی ہے۔ اب تمہارے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہ گئے تو یاد رکھو کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو خدا نے ہمیشہ تباہ کر دیا ہے۔ یہ تاریخ کی ایک معروف حقیقت ہے جس کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے تمہیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک میں تم آج بااقتدار ہو خود اسی کی تاریخ میں تمہارے لیے کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ تم اس سرزمین پر پہلے آنے والے نہیں ہو بلکہ تم سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں جو اسی طرح اقتدار کی مالک ہوئیں جس طرح تم۔ بلکہ بعض اپنے اقتدار و سطوت کے اعتبار سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انہی کے وارث تم ہوئے ہو۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ قدرت کا قانون تمہارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کرے جو اس نے ان کے ساتھ کیا۔ ان کے جن جرائم کی بنا پر خدا نے ان کو ہلاک کر کے ان کی جگہ تم کو بخشی، انہی جرائم کے مرتکب تم ہوئے تو خدا تم کو دندناتے پھرنے کے لیے کیوں چھوڑے رکھے گا، خدا کا قانون تو سب کے لیے ایک ہی ہے۔

انعام کے بعد اعراف، انعام کی مثنیٰ سورہ ہے۔ اس میں دعوت کے بجائے انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں صاف صاف قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو بس سمجھ لو کہ اب تم خدا کے عذاب کی زد میں ہو۔ اس میں پہلے ان کی فردِ قرار دادِ جرم کی طرف اجمالاً اشارہ کیا، اس کے بعد تفصیل کے ساتھ ان تمام پچھلی قوموں کی تاریخ سنائی جو اس ملک میں اقتدار پر آئیں اور یکے بعد دیگرے اسی جرم میں کیفرِ کردار کو پہنچیں جس کے مرتکب قریش ہوئے۔ یہ تفصیل گویا انعام کی آخری آیت کے اجمال کی تفصیل ہے۔ اسی کے ساتھ یہود کو بھی لے لیا ہے اور ان کو بھی بالکل آخری تنبیہ فرمائی ہے۔ آخر میں عہدِ فطرت کو، جو تمام ذریتِ آدم سے لیا گیا ہے، بنیاد قرار دے کر انذار کے مضمون کو اس کے آخری نتائج تک پہنچا دیا ہے جس کے بعد برأت، ہجرت اور اعلانِ جنگ یا نزولِ عذاب کے مراحل

سامنے آجاتے ہیں۔

اب ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ پوری سورہ بیک نظر نگاہ کے سامنے آجائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ اس کتاب الٰہی سے متعلق تمھاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کر دو تاکہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ تم پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول بھی کرلیں۔ اس سے فائدہ صرف اہلِ ایمان ہی اٹھائیں گے۔ قریش کو تنبیہ کہ اس کتاب کو قبول کرو ورنہ یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں رسولوں کی تکذیب کے جرم میں ہلاک ہو چکی ہیں اور جب خدا کا عذاب ان پر آیا تو اس کے مقابل میں وہ کوئی بند نہ باندھ سکیں بلکہ انھوں نے خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور عذاب الٰہی کی پکڑ میں آگئیں۔ پھر تم پر ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس میں تم سے تمھاری ذمہ داریوں کے بابت پرسش ہونی ہے اور رسول سے اس کی ذمہ داری کے بابت۔ اس دن سارا کچا چٹھا ہم سب کے سامنے رکھ دیں گے۔ اس دن جو میزانِ عدل نصب ہوگی وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ کس کے پاس کتنا حق ہے، کتنا باطل۔ اس دن فلاح صرف وہی پائیں گے جن کے پلڑے بھاری ہوں گے۔ باقی سب نامراد ہوں گے۔

(۱۰-۲۵) قریش کو تنبیہ کہ اس ملک میں تمھیں جو اقتدار حاصل ہوا، خدا ہی کا بخشا ہوا ہے۔ اسی نے تمھارے لیے معاش و معیشت کی راہیں فراخ کیں۔ لیکن شیطان نے تم پر حاوی ہو کر تم کو ناشکری کی راہ پر ڈال دیا۔ آدمؑ اور ابلیس کے ماجرے کا حوالہ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیطان نے ذریتِ آدم کو جو دھمکی دی تھی کہ وہ ان کو اپنی چالوں سے گمراہ کر کے چھوڑے گا، ان کی اکثریت خدا کی نافرمان و ناشکری بن جائے گی، اس نے اپنی وہ دھمکی تمھارے اوپر سچ کر دکھائی۔ جس طرح اس نے آدم و حوا کو دھوکا دے کر جنت سے نکلوایا اسی طرح اس نے اپنا فریب تم پر چلایا ہے تو تم شیطان کے چکموں میں آکر اس کی امیدیں برآنے کے سامان نہ کرو۔

(۲۶-۳۰) یہ تذکیر کہ تم نے آدم کی اولاد ہو کر شیطان کی اس دشمنی کو یاد نہ رکھا جو اس نے تمھارے باپ کے ساتھ کی۔ اس نے انھیں فتنے میں ڈالا اور حلّہ جنت سے محروم کر کے جنّت سے نکلوایا۔ وہی کھیل وہ تمھارے ساتھ کھیلا ہے۔ خدا نے تم کو ظاہر و باطن کے جس لباس سے مزیّن کرنا چاہا شیطان کی اطاعت میں تم نے وہ دونوں جامے اتار پھینکے۔ تقویٰ کا لباس بھی جو باطن کی زینت ہے، اتار کر پھینک دیا اور ظاہر کا لباس بھی اتار دیا چنانچہ عین حرمِ الٰہی میں، اس نے تمھیں عریاں طواف پر ورغلایا اور تم اس بے حیائی کو نہ صرف باپ دادا کی وراثت سمجھتے ہو بلکہ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اس کا حکم تمھیں خدا نے دیا ہے۔ سوچو کہ خدا ایسی بے حیائی کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؛ خدا نے تو ہر باب میں صرف حق و عدل کا حکم دیا ہے، صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، توحید کا حکم دیا ہے۔ تم نے شیطان کی پیروی میں اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کیا اور دعویٰ کرتے ہو

کہ یہی راہ ہدایت کی راہ ہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس فتنہ سے محفوظ رہ سکے۔

(۳۱-۳۴) قریش کو تنبیہ کہ اپنے جی سے تم نے یہ جو حرام و حلال بنا رکھا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ خدا نے نہ تو زینت حرام کی ہے اور نہ کھانے پینے کی چیزیں حرام کی ہیں۔ یہ دنیا میں بھی اہل ایمان کے لیے مباح ہیں اور آخرت میں تو وہ ان کے بلا شرکت غیرے حق دار ہوں گے ہی۔ خدا نے حرام بے حیائی کو ٹھہرایا ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی، حق تلفی اور سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے جن کا کوئی جواز نہیں، شرک کو ٹھہرایا ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں اور اللہ کے اوپر افترا کو حرام ٹھہرایا ہے۔ لیکن تم ان ساری ہی باتوں کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اگر اس کے باوجود تمھیں مہلت مل رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں ہر امت کی تباہی کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

(۳۵-۴۳) اس امر کی یاددہانی کہ ذریت آدمؑ کو ابتدا ہی میں یہ ہدایت کردی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے رسول بھیجے گا تو جو لوگ ان رسولوں کی پیروی کریں گے وہ جنت حاصل کریں گے، جو ان کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔ یہ دوزخ میں پڑنے والے سب ایک دوسرے کے اوپر لعنت بھیجیں گے اور ان کو کسی طرح دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ بس دوزخ کی آگ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنے گی۔ البتہ جو اہل ایمان ہوں گے وہ جنت حاصل کریں گے اور وہ باہمگر ایک دوسرے کی ملاقات سے مسرور اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں پر شکرگزار رہیں گے۔ وہ اعتراف کریں گے کہ یہ ہیں جو کچھ خدا نے بخشا اپنے رسولوں کی پیروی کے طفیل بخشا۔ رسولوں نے جو کچھ فرمایا سب حرف حرف سچ ثابت ہوا۔

(۴۴-۵۳) اہل جنت کا اہل دوزخ سے خطاب کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے فرمائے تھے وہ سب حرف بحرف پورے ہوئے، تم بتاؤ کہ تم نے بھی وہ سب کچھ دیکھ لیا یا نہیں جس سے تمھیں آگاہ کیا گیا تھا؟ اہل دوزخ پر خدا کی طرف سے لعنت کا اعلان۔ اس امر کا بیان کہ مقام اَعراف سے اہل ایمان کے ایک گروہ کو دوزخ اور جنت دونوں کا مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ خدا نے رسولوں کے ذریعے سے جن باتوں کی خبر دی تھی وہ سب پوری ہوئیں۔ اصحاب اعراف کی طرف سے اہل جنت کو مبارک باد اور اہل دوزخ کو ملامت۔ اہل دوزخ کی اہل جنت سے فریاد کہ وہ ان پر کچھ کرم کریں۔ اہل جنت کی طرف سے جواب کہ جنت کی نعمتیں کفار پر حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کہ جنھوں نے دنیا میں خدا کی باتوں کو نظرانداز کیا آج خدا نے ان کو نظرانداز کر دیا ہے۔ کفار کی طرف سے اپنی محرومی و بدبختی پر اظہارِ حسرت۔

(۵۴-۵۸) کفار قریش کو تنبیہ کہ خلق و امر سب خدا ہی کے اختیار میں ہے تو امید و بیم ہر حالت میں اسی کو پکارو۔ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔ قیامت شدنی ہے۔ موت کے بعد زندگی کا مشاہدہ تم اس کائنات میں برابر کر رہے ہو۔ خدا نے ہر پہلو سے اپنی آیات واضح فرما دی ہیں۔

(۵۹-۹۳) قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، قوم شعیبؑ کی سرگزشتیں، جو اس بات کا تاریخی ثبوت ہیں کہ جو قومیں فساد فی الارض کی مرتکب ہوتی اور اپنے رسول کی دعوت اصلاح کی تکذیب کر دیتی ہیں اللہ تعالیٰ ان

کو صفحہ ارض سے مٹا دیتا ہے۔

(۹۴-۱۰۲) مذکورہ بالا سرگزشتوں پر ایک اجمالی تبصرہ۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرتا ہے اس کے بعض بنیادی اصول اور بعض حکمتیں اور عبرتیں۔ قریش کو یہ تنبیہ کہ انہی کے خلف تم ہو تو اگر تم دیدۂ عبرت سے دیکھتے تو تمھارے اپنے ملک کی تاریخ میں تمھارے لیے کافی سامان بصیرت موجود ہے لیکن جس طرح ان قوموں کے دلوں پر اللہ کی مہر لگ گئی تھی اسی طرح تمھارے دلوں پر بھی اللہ کی مہر لگ چکی ہے۔

(۱۰۳-۱۳۶) حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت جس سے واضح ہوتا ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کو شکست دینے کے لیے تمام ہتھکنڈے، جو اس کے امکان میں تھے، استعمال کیے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بامراد کیا اور فرعون کو، تمام اسباب و وسائل کے علی الرغم شکست دی۔ مفسدین کا بیڑا غرق ہوا اور جو جماعت مظلوم و مقہور تھی خدا نے اس کو، اس کی استقامت کی بدولت، زمین میں اقتدار بخشا۔

(۱۳۷-۱۷۱) بنی اسرائیل کی تاریخ کے تمام ادوار پر ایک جامع تبصرہ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ بڑے بڑے کرم فرمائے لیکن انھوں نے شروع سے لے کر اب تک ہمیشہ خدا کے انعامات کی ناقدری کی اور کسی تذکیر و تنبیہ سے بھی کوئی پائدار فائدہ نہیں اٹھایا اور اب بھی ان کی روش یہی ہے چنانچہ جس حق کی علمبرداری کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی وہ اس کی مخالفت میں پیش پیش ہیں حالانکہ یہ موقع ان کے لیے آخری موقع ہے جس کو ضائع کر دینے کے بعد ان کے لیے دائمی ذلت کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔

(۱۷۲-۲۰۶) خاتمۂ سورہ جس میں قریش کو عہد فطرت کی یاددہانی کی گئی ہے اور بنی اسرائیل کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پھر ان کو عذاب الٰہی کی دھمکی دی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ جب اللہ کی پکڑ میں آجاؤ گے تو تمھارے یہ اولیا و اصنام جو تم نے گھڑ رکھے ہیں کچھ کام نہیں آئیں گے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر، اعراض اور ہر آن یاد الٰہی کے ساتھ وابستہ رہنے کی ہدایت۔

سُوۡرَۃُ الۡاَعۡرَافِ (۷)

مَکِّیَّۃٌ ——— اٰیَاتُھَا ۲۰۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱ - ۹

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ
لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ
مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳﴾
وَ کَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ
قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا کَانَ دَعۡوٰىہُمۡ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ
اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ
وَ لَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیۡہِمۡ بِعِلۡمٍ وَّ مَا کُنَّا
غَآئِبِیۡنَ ﴿۷﴾ وَ الۡوَزۡنُ یَوۡمَئِذِ ۣالۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ
فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۸﴾ وَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ
الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ بِمَا کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۹﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

یہ الٓمّٓصٓ ہے۔ یہ کتاب ہے جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے تو اس کے باعث
تمھارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو تاکہ تم اس کے ذریعے سے لوگوں کو ہوشیار کر دو اور
اہلِ ایمان کے لیے یاد دہانی ہے۔ لوگو، جو چیز تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب

سے آتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے ماسوا سرپرستوں کی پیروی نہ کرو، بہت کم ہی تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو! اور کتنی ہی بستیاں ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب رات میں اچانک یا دن دھاڑے جب وہ دوپہر کے آرام میں تھے۔ تو جب ہمارا عذاب ان پر آیا اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکے کہ بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے۔ سو یاد رکھو، ہم ان لوگوں سے پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ہم استفسار کریں گے۔ پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کریں گے پورے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہیں رہے ہیں۔ اس دن وزن دار صرف حق ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار اور اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ ۱-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓصٓ' حروف مقطعات پر تفصیلی بحث بقرہ میں الٓمّٓ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں الف، لام، میم پر حرف ص کا اضافہ ہے۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ جن سورتوں کے نام کچھ مشترک سے ہیں ان کے مطالب میں بھی فی الجملہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ کو غور سے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بہت سی باتیں بقرہ سے ملتی جلتی ہیں اگرچہ دونوں میں مکی و مدنی کا فرق بھی ہے اور دونوں کے مخاطب بھی الگ الگ ہیں۔

یہاں تالیف کلام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ الٓمّٓصٓ کو بحذف مبتدا مستقل جملہ بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس کو آگے سے ملانا چاہیں تو اس کو مبتدا اور 'كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ' کو اس کی خبر بھی مان سکتے ہیں۔ ہم نے پہلی شکل اختیار کی ہے اور 'كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ' میں بھی مبتدا کو محذوف مانا ہے۔ ویسے دونوں شکلوں میں باعتبار مفہوم کوئی فرق نہیں ہے۔

قریش کی مخالفت کے دورِ شباب میں آنحضرت صلعم کو تسلی اور آپ کی ذمہ داری کی ۔

'کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ' 'حرج' کے معنی تنگی، ضیق اور پریشانی کے ہیں۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ یہ دور، جیسا کہ سورہ کے مطالب کی فہرست سے واضح ہے، قریش کی مخالفت کے شباب کا دور تھا۔ وہ ہر قسم کے اوچھے سے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے تھے۔ آپ کو زچ کرنے کے لیے روز نت نئے مطالبے وہ پیش کرتے۔ ایک طرف مخالفت کی یہ شدت تھی دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرض دعوت کا احساس اتنا شدید تھا کہ سارے جتن کرنے کے باوجود آپ کو یہ فکر دامن گیر ہی رہتی کہ مبادا میری ہی کوئی کوتاہی ہو جس کے سبب سے یہ لوگ اتنی صاف اور واضح حقیقت کے قائل نہ ہو رہے ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مل کر آپ کے دل پر ایک بھاری بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ قرآن نے یہاں یہ دونوں بوجھ ہلکے کیے ہیں۔ قریش کی مخالفت سے بے پروا ہونے کی یوں تلقین فرمائی کہ یہ کتاب نہ تمھاری اپنی پیش کردہ ہے نہ خدا سے درخواست کر کے تم نے اپنے اوپر اتروائی ہے بلکہ یہ تمھاری طلب و تمنا کے بغیر خدا کی طرف سے تم پر اتاری گئی ہے تو تم اس کے مخالفوں کی مخالفت سے اپنے آپ کو ضیق و پریشانی میں کیوں مبتلا کرو؟ جس خدا نے یہ اتاری ہے وہی اس کی تائید و نصرت کے لیے کمک اور بدرقہ بھی فراہم کرے گا۔ نہ وہ کوئی کمزور ہستی ہے نہ حالات سے بے تعلق یا بے خبر ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جو ذمہ داری اس نے تم پر ڈالی ہے اس کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لیے تم کن چیزوں کے محتاج ہو اور راہ کے پتھروں کو ہٹانے کے لیے تمھیں کتنی قوت درکار ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں فراہم کرے گا تو تم خاطر جمع رکھو اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔

'لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ' یہ اس کتاب سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد بتا دی گئی ہے کہ آپ کا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو تکذیب رسول کے نتائج اور قیامت کے احوال سے اچھی طرح ہوشیار کر دیں۔ یہ مانتے ہیں یا نہیں، یہ سوال آپ سے متعلق نہیں ہے۔ آپ پر ذمہ داری صرف انذار و بلاغ کی ہے۔ 'وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ' کا ٹکڑا معناً عطف 'لِتُنْذِرَ' ہی پر ہے لیکن یہ فعل کے بجائے اسم کی شکل میں ہے۔ اس کے اسم کی شکل میں لانے سے ایک امر واقعہ کا اظہار مقصود ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک انذار کا تعلق ہے وہ تو تم ان کفار کو کر دو لیکن اس سے یاددہانی کا فائدہ صرف اہل ایمان ہی اٹھائیں گے۔ یہ مضمون جگہ جگہ، قرآن میں مختلف سورتوں میں، بیان ہوا ہے۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ 'طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى' طٰهٰ ۱-۴) (یہ سورہ طٰہٰ ہے، ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تمھاری زندگی تمھارے لیے اجیرن ہو کے رہ جائے، یہ تو بس یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ڈریں، یہ تو نہایت اہتمام سے اتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے زمین اور ان بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔)

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۳)

کفار قریش کو عذاب کی دھمکی عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا مخاطب مسلمانوں کو مانا ہے لیکن سیاق و سباق اور آیت کے الفاظ دلیل ہیں کہ خطاب کفار قریش سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر والی آیت میں تسلی دینے کے بعد اب یہ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ یہ چیز جو تم پر تمھارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور خدا کے ماسوا دوسرے معبودوں اور شریکوں کی پیروی نہ کرو، یہ خیالی اولیاء واصنام تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ اس کے بعد باندازِ حسرت و افسوس فرمایا کہ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ کہ تم ایسے شامت زدہ لوگ ہو کہ مشکل ہی سے یاددہانی حاصل کرتے ہو۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۴-۵)

'قریہ' کا مفہوم 'قَرْيَة' کا لفظ قریہ اور اہل قریہ دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے ضمیر میں، اشارات اور فعل وغیرہ استعمال کرنے میں، کبھی لفظ کا اعتبار کرتے ہیں، کبھی مفہوم کا۔ یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔

'قَآئِلُوْنَ' 'قیلولہ' سے ہے۔ 'قیلولہ' کے معنی دوپہر منانے کے ہیں، سونا اس کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ عرب کا ملک، گرم ملک ہے اس وجہ سے وہاں دوپہر میں لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے مکانوں، ڈیروں، خیموں اور باغوں میں آرام کریں۔

اہل تاویل کی ایک غلط فہمی بعض اہل تاویل کو 'فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ' کے الفاظ سے یہ خیال ہوا ہے کہ اللہ کا عذاب اس وقت آتا ہے جب لوگ رات میں یا دن میں سوئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ بات تاریخ کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی۔ سورہ انعام میں ہے۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۷) (کہو، بتاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک چپکے سے یا کھلم کھلا آدھمکے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا!) اسی سورہ اعراف میں معذب قوموں کی سرگزشتیں سنانے کے بعد ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے۔ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ (۹۷-۹۸) (کیا یہ بستیوں والے مامون ہوگئے اس بات سے کہ ہمارا عذاب ان پر رات میں آدھمکے جب وہ سوتے ہوئے ہوں! کیا یہ بستیوں والے مامون رہے کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آدھمکے جب کہ وہ لہو و لعب میں مشغول ہوں) ہمارے نزدیک 'فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ' سے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے کہ خدا کا عذاب اس وقت آیا کرتا ہے جب لوگ سوتے ہوتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خدا کا عذاب شب کی تاریکیوں میں چپ چپاتے بھی آیا اور ڈنکے کی چوٹ دن دھاڑے بھی۔ جس وقت بھی آیا آگیا، نہ کوئی اس کو روک سکا اور نہ کوئی اس سے اپنے کو بچا سکا۔ صرف وہ لوگ اس سے بچ سکے جن کو اللہ کی امان حاصل ہوئی۔

اصل انذار یہ وہ انذار ہے جس کا 'وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ' میں اشارہ ہے۔ قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ کتنی قومیں اور بستیاں ہیں

جن پر رات میں یا دن میں جب خدا نے چاہا اپنا عذاب بھیج دیا اور وہ تباہ کر دی گئیں، ان میں سے کوئی بھی خدا کے مقابل میں کھڑی نہ ہو سکی بلکہ ہر قوم نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کے حوالہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے بھی اس چیز کی پیروی نہ کی جو خدا نے تم پر اتاری ہے تو یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔ آج اکڑتے ہو لیکن اس وقت سارے کس بل نکل جائیں گے اور تم خود اپنے منہ سے اپنے جرم کا اقرار کرو گے لیکن اس وقت یہ اقرار تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہو گا۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (۶-۹)

انذار کی تفصیل

'فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ'۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ کے رسول دو چیزوں سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کرنے والی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دوسرے اس جزا و سزا سے جس سے آخرت میں ہر شخص کو لازماً دوچار ہونا ہے۔ اوپر والی آیت میں پہلی چیز سے ڈرایا ہے۔ اب آگے اس دوسری چیز سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہم ان اُمتوں سے بھی پرسش کریں گے جن کی طرف ہم نے اپنے رسول بھیجے اور خود رسولوں سے بھی سوال کریں گے۔

اُمتوں سے جو پرسش ہونی ہے اس کی تفصیل قرآن میں یوں بیان ہوئی ہے۔

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ	جب جب ان کی کوئی بھیڑ دوزخ میں جھونکی جائے گی
خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝	اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے، کیا تمہارے پاس
قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا	کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے، ہاں
وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ	ہمارے پاس ایک ہوشیار کرنے والا آیا تو تھا پر ہم نے اس
اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝	کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں اتاری
وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ	ہے، تم لوگ ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ وہ
مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝	اعتراف کریں گے کہ اگر ہم سنتے سمجھتے ہوتے تو جہنم میں پڑنے
فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ	والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے تو لعنت ہو
السَّعِيْرِ۔ ملک ۸ - ۱۱	ان دوزخیوں پر۔

رسولوں سے جو سوال ہو گا اس کا حوالہ سورہ مائدہ میں یوں دیا گیا ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ	جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا تمہیں
مَاذَآ اُجِبْتُمْ۔ ۱۰۹۔ مائدہ	کیا جواب ملا؟

'فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ'، مطلب یہ ہے کہ اس دن ہم رسولوں اور اُن کی قوموں کو ساری

گزری ہوئی روداد، پورے علم و خبر کے ساتھ سنا دیں گے کہ ہمارے رسولوں نے کس طرح حق بلاغ ادا کیا اور ان کی تکذیب کرنے والوں نے کس طرح جان بوجھ کر ان کی تکذیب کی۔ فرمایا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی ان حالات وواقعات سے بے تعلق یا بے خبر نہیں رہے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے ہمارے سامنے ہوا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ سنانا قطع عذر کے لیے ہوگا تاکہ کسی کے لیے بھی لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

میزانِ قیامت میں وزن دار صرف حق ہوگا

'وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ' مطلب یہ ہے کہ اس دن وزن رکھنے والی شے صرف حق ہوگا۔ باطل میں سرے سے کوئی وزن ہی نہیں ہوگا۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ جو ترازو نصب فرمائے گا وہ ہر ایک کے اعمال تول کر بتا دے گی کہ اس میں حق کا حصہ کتنا ہے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے (یعنی حق کی مقدار ان کے ساتھ زیادہ ہوگی)، وہ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ خائب و خاسر ہوں گے۔ اعمال کے باوزن اور بے وزن ہونے کے باب میں قرآن نے یہ اصول بھی بیان فرمایا ہے۔ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۱۰۵-۱۰۳ کہف (کہہ دو ہم تمہیں بتائیں گے کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہوں گے؟ وہ جن کی ساری سرگرمیاں طلب دنیا میں برباد ہوئیں اور وہ اس خوش گمانی میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں، وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور ملاقات کا انکار کیا تو ان کے اعمال ڈھے گئے، تو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن نہیں قائم کریں گے) اس سے معلوم ہوا کہ میزان قیامت میں وزن دار اعمال وہی ہوں گے جو خدا کی رضا اور آخرت کے لیے انجام دیے جائیں۔ جو اعمال اس وصف سے خالی ہوں گے نہ وہ اعمال حق ہیں، نہ میزان الٰہی میں ان کا کوئی وزن ہوگا۔

زبان کا ایک اسلوب

'وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ...... بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ' ہم ایک سے زیادہ مقامات میں زبان کے اس اسلوب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جب صلہ اور فعل میں مناسبت نہ ہو تو وہاں تضمین ہوتی ہے یعنی کوئی ایسا فعل وہاں محذوف ماننا پڑے گا جو موجود خلا کو بھر سکے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لفظ کم استعمال ہوتے ہیں، لیکن معنی میں بہت وسعت ہو جاتی ہے۔ یہاں تضمین کھول دی جائے تو پوری بات یوں ہوگی بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَيَظْلِمُوْنَ اَنْفُسَهُمْ بوجہ اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔

۲- آگے کا مضمون —— آیات ۱۰-۲۵

پہلے قریش کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا احسان جتا کر ان کو ملامت کی کہ کس طرح اللہ نے تم کو اس سرزمین محترم میں قوت و شوکت دی، تم کو خوف سے بے خوف کیا اور تمہارے لیے معاش و معیشت کی راہیں۔

کھولیں لیکن تم خدا کے شکر گزار و فرمانبردار ہونے کے بجائے ناشکرے اور اس کے نافرمان ہو گئے۔

اس کے بعد آدمؑ و ابلیس کا وہ ماجرا جو بقرہ میں یہود کو سنایا گیا ہے بعض تفصیلات کے اضافہ کے ساتھ قریش کو سنایا کہ شیطان نے آدمؑ اور ان کی ذریت کی ابدی دشمنی کی جو قسم کھائی تھی وہ قسم جس طرح آدمؑ و حوا کو دھوکا دے کر اور جنت سے نکلوا کر اس نے ان پر پوری کی، اسی طرح اس نے اپنی وہ قسم تم پر بھی پوری کر لی ہے اور تم پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے ہو اور اس کا جو نتیجہ تمھارے حق میں نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے ــــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۲۵

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا
تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ
اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڰ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ
السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ
اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲ قَالَ
فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ
الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴ قَالَ اِنَّكَ
مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۱۵ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ
وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ
شٰكِرِيْنَ ۝۱۷ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ
مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۸ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ
فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا

مَا وٗرِیَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ
قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا
ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا
الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا
رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ
فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا
تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۲ ۵ ۹

ترجمہ آیات ۱۰-۲۵

اور ہم نے تمھیں اس ملک میں اقتدار بخشا اور تمھارے لیے معاش کی راہیں کھولیں، پر تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔ ۱۰

اور ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر تمھاری صُورت گری کی، پھر فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو، سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہُوا۔ فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا، پھر تو یہاں سے اُتر، تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ کرے، تو نکل، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا، اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے دے جس

دن لوگ اُٹھائے جائیں گے، فرمایا، تو مہلت دے دیا گیا۔ بولا، چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا، تو یہاں سے نکل خوار اور راندہ۔ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۱-۱۸

اور اے آدم، تم اور تمھاری بیوی رہو جنت میں اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو۔ بس اس درخت کے پاس نہ پھٹکیو کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤ۔ پس شیطان نے ان کے اندر وسوسہ اندازی کی کہ عریاں کر دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے خداوند نے تو تمھیں اس درخت سے صرف اس وجہ سے روکا کہ تم کہیں فرشتے یا ہمیشہ زندہ رہنے والے نہ بن جاؤ۔ اور ان سے قسمیں کھائیں کہ میں تمھارے خیرخواہوں میں ہوں۔ اس طرح اس نے فریب سے ان کو شیشے میں اتار لیا۔ پس جب انھوں نے درخت کا پھل چکھ لیا تو ان کی شرم کی جگہیں ان کے سامنے بے پردہ ہو گئیں اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو آواز دی کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے؟ وہ بولے اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔ فرمایا، اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت خاص تک ٹھہرنا اور کھانا بلنا ہے۔ فرمایا، اسی میں تم جیو گے، اسی

ہیں مروگے اور اسی سے نکالے جاؤگے۔ ۱۹ - ۲۵

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۱۰)

ارض سے مراد سرزمین حرم ہے

'تمکین فی الارض' سے مراد زمین میں اختیار و اقتدار بخشنا ہے۔ مثلاً وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۲۱- یوسف (اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک مصر میں اختیار و اقتدار بخشا) 'ارض' اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن خطاب چونکہ قریش سے ہے اس وجہ سے اس سے مراد یہاں سرزمین حرم ہے جس میں قریش کو اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ 'معایش' سے اشارہ ان معاشی سہولتوں اور برکتوں کی طرف ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں

قریش کا اختیار و اقتدار سرزمین حرم میں

حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں۔ قرآن میں ان برکتوں اور نعمتوں کا جگہ جگہ ذکر ہوا ہے اور ہم تفصیل کے ساتھ بقرہ میں ان کا حوالہ دے چکے ہیں۔ سورہ قصص میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ۵۷۔ قصص (کیا ہم نے ان کو ایک پرامن حرم میں اقتدار نہیں بخشا جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں) 'قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ' یہ وہ اصل بات ارشاد ہوئی ہے جس کے کہنے ہی کے لیے اوپر والی باتیں بطور تمہید بیان ہوئیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی دعاؤں اور بیت اللہ کے طفیل تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں اختیار و اقتدار کی نعمت بھی بخشی اور معاش و معیشت کی نہایت فراخ راہیں بھی کھولیں لیکن تم سخت ناشکرے نکلے کہ تم نے اپنے پروردگار کے بجائے شیطان کی، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے، پیروی کی اور اس نے جن جن فتنوں میں تم کو مبتلا کرنا چاہا ہے تم ان سب میں مبتلا ہو گئے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڰ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۱ - ۱۸)

آدم و ابلیس کا ماجرا اور اس کے مضمرات

اب یہ آدمؑ اور ابلیس کا وہ ماجرا سنایا جا رہا ہے جس سے آدم اور ان کی ذریت کے ساتھ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی دشمنی کی تاریخ بھی سامنے آتی ہے، اس کا اصل سبب بھی واضح ہوتا ہے اور قیامت

تک کے لیے اس کو باقی رکھنے اور اولادِ آدمؑ سے انتقام لینے کا شیطان نے جو عہد کر رکھا ہے، اس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس قصے کو پڑھتے ہوئے وہ مقصد نگاہ سے اوجھل نہ ہو جس کے لیے یہ سنایا گیا ہے۔

شیطان کو آدمؑ اور ان کی ذریت سے دشمنی اس حسد کی بنا پر ہے جو آدمؑ کی تکریم کے حکم سے اس کو لاحق ہوا۔ اس حکم کی تعمیل سے اس نے نہایت تکبر کے ساتھ انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ نہایت ذلت کے ساتھ جنت سے نکالا گیا۔ بالآخر اس نے اس غصہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ اسے اٹھائے جانے کے دن تک کے لیے یہ مہلت دی جائے کہ وہ آدمؑ اور اولادِ آدمؑ پر اپنے جوہر آزمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ یہ درخواست منظور ہو جانے کے بعد شیطان نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ میں ان کو توحید کی راہ سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالوں گا اور ان کو اپنی تدبیروں، چالوں اور اپنے پروپیگنڈوں سے اس طرح بدحواس کر دوں گا کہ ان کی اکثریت تیری توحید کی راہ سے ہٹ جائے گی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ، جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی، ہرگز کسی فضیلت کا سزاوار نہیں ہے۔

اس کے بین السطور پر غور کیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آئیں گی۔

ایک یہ کہ شیطان کو اصل کد انسان سے یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس پر ترجیح کیوں دی؟ اس نے اسی ترجیح کو غلط ثابت کرنے کے لیے خدا سے مہلت مانگی ہے۔ اب یہ انسان کی کیسی بدبختی ہے کہ وہ اس معرکے میں جو خود اسی کے خلاف شیطان نے برپا کیا ہے، شیطان کا دست و بازو بن جائے اور خود اپنے عمل سے شیطان کے حق میں گواہ بن کر یہ ثابت کر دے کہ خدا نے اس کو جس عزت کا اہل سمجھا درحقیقت وہ اس کا اہل نہیں تھا بلکہ اس کے باب میں شیطان ہی کا گمان صحیح تھا۔

دوسری یہ کہ انسان اس دنیا میں ایک کارزارِ امتحان میں ہے جہاں شیطان سے ہر قدم پر اس کا مقابلہ ہے۔ شیطان اپنے سارے داؤں، سارے فریب، سارے جوہر انسان پر استعمال کرنے کے لیے خدا سے مہلت لے چکا ہے۔ خدا نے اس کو، جہاں تک ورغلانے کا تعلق ہے، مہلت دے دی ہے اور یہ مہلت اس کو قیامت کے دن تک کے لیے حاصل ہے۔ قیامت کے دن یہ فیصلہ ہوگا کہ کون جیتا اور کون ہارا؟

تیسری یہ کہ شیطان کی اس ساری سعیِ اغوا و اضلال میں اصل ہدف عقیدۂ توحید ہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر گھات لگانے اور شبخون مارنے کا اس نے الٹی میٹم دیا ہے کہ میں اس راہ سے انسان کو ہٹا کر چھوڑوں گا اور انسانوں کی اکثریت اس سے منحرف ہو کر خدا کی ناشکری کرنے والی بن جائے گی۔ اوپر قرآن کو 'قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ' کے الفاظ سے اسی امر واقعی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ شیطان نے انسان کے بارے میں جو گمان ظاہر کیا تھا تم نے اس کو اپنی نالائقی سے حرف حرف سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ اس وجہ سے تم خود اسی انجامِ بد کے مستوجب بن چکے ہو جس کی خبر شیطان کے الٹی میٹم کے جواب میں خدا نے سنا دی تھی کہ میں تجھ کو

اور تیری پیروی کرنے والوں کو جہنم میں بھر دوں گا۔

نظمِ کلام کے واضح ہو جانے کے بعد الفاظ اور اجزائے کلام کی وضاحت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان میں سے اکثر چیزیں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے زیرِ بحث آ چکی ہیں۔ ان کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ البتہ جو چیزیں وہاں زیرِ بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم یہاں کیے دیتے ہیں۔

لفظ 'خلق' کا مفہوم

'وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ الاٰیۃ'۔ 'خلق' کا صحیح لغوی مفہوم، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، کسی چیز کا خاکہ (DESIGN) بنانا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تنہا بھی استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ اپنے دوسرے لوازم و متعلقات مثلاً 'برء'، 'تسویہ'، 'ترکیب' اور 'تصویر' کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ جہاں یہ تنہا استعمال ہُوا ہے وہاں یہ اپنے تمام لوازم و متعلقات پر مشتمل ہے۔ لیکن جہاں اپنے دوسرے متعلقات کے ساتھ آیا ہے جیسے یہاں 'خَلَقْنٰكُمْ' کے بعد 'صَوَّرْنٰكُمْ' بھی ہے تو ایسے مواقع میں یہ اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں 'خلق' اور 'تصویر' کے دو لفظوں نے تخلیق کی ابتدائی اور انتہائی دونوں حدیں واضح کر دیں۔ ہر مخلوق کا مرحلۂ ابتدائی تو یہ ہے کہ اس کا خاکہ بنا اور اس کا آخری و تکمیلی مرحلہ یہ ہے کہ اس کی صورت گری ہوئی اور اس کے ناک نقشے اور نوک پلک درست ہُوئے۔

یہاں مخاطب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش ہیں، اور بیان ان کے سامنے نوعِ انسانی کی تخلیق اور ان آزمائشوں کا ہو رہا ہے جو انسان کے لیے مقدر کی گئی ہیں۔ حضرت آدمؑ تمام نسلِ انسانی کے باپ ہیں اس وجہ سے ان کی سرگزشت تنہا انہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ پوری نسلِ انسانی کی سرگزشت ہے۔

شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے

'ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ' سجدہ کے مفہوم، اس حکم کی مصلحت، جنات کے اس حکم میں شامل ہونے کی وجہ اور اس ذیل کے دوسرے اہم مسائل پر ہم بقرہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ 'ابلیس' اس جن کا لقب ہے جس نے باوا آدمؑ کو دھوکا دیا۔ یہ جنات میں سے تھا اور خدا کی نافرمانی کر کے سرکش بن گیا۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ اس کے پیرو بن جاتے ہیں وہ سب اس کی معنوی ذریت ہیں۔ ایسے ہی جنوں اور انسانوں کے لیے قرآن میں شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ شیطان، جیسا کہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا، کوئی مستقل بالذات مخلوق نہیں ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

'قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ' قرآن میں، دوسرے مقام میں، یہی بات یوں فرمائی گئی ہے قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۔ (ص:۷۵) (فرمایا، اے ابلیس تجھے اس چیز کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا) دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک جگہ 'مَا مَنَعَكَ' کے بعد 'لا' ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ 'مَا مَنَعَكَ' میں چونکہ خود 'لا' کا مضمون موجود ہے اس وجہ سے اس کے بعد اس کا لانا ضروری نہیں ہے لیکن لائیں تو اس سے شدتِ نکیر کا مضمون پیدا ہوگا۔ چنانچہ اس فقرے میں شیطان کے عدم سجدہ کی شناعت پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ اسلوب ہماری اپنی زبان

میں بھی ہے۔

آدمؑ بجائے خود سزاوار سجدہ نہیں تھے

'اِذْ اَمَرْتُکَ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمؑ بجائے خود سزاوار سجدہ نہیں تھے بلکہ خدا کے حکم کی بنا پر اس کے سزاوار ہوئے تھے اور ان کو سجدہ اصلاً و حقیقۃً ان کو سجدہ نہیں تھا، بلکہ خود خدا کو سجدہ تھا اس لیے کہ یہ سجدہ اسی کے امتثال امر میں تھا۔

نسل و نسب کو بنائے شرف سمجھنا ابلیس کی وراثت ہے

'قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ'۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی سرکشی کی بنیاد اس گھمنڈ پر تھی کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب سے ہے اور اس اعتبار سے وہ انسان سے اشرف ہے۔ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن نے یہاں یہ رہنمائی دی کہ شرف و عزت کو نسل و نسب سے متعلق سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے اسی کی وراثت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز سبب عزت و سرخروئی ہے وہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہے اس کے سوا کوئی چیز بھی خدا کے ہاں عزت پانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

تکبر شرک ہے

'قَالَ فَاھْبِطْ مِنْھَا فَمَا یَکُوْنُ لَکَ اَنْ تَتَکَبَّرَ فِیْھَا الایۃ'۔ جانتے بوجھتے خدا کے حکم سے سرکشی تکبر ہے۔ جو اس تکبر میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا سے بڑا یا اس کا ہم سر ٹھہراتا ہے جو صریحاً شرک ہے۔ کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے۔ جو اس میں حصہ بٹانے کے مدعی بنتے ہیں ان پر خدا کی طرف سے ذلت کی مار پڑتی ہے۔ متکبر کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بہشت صرف خاشعین و عابدین کی جگہ ہے اس وجہ سے ابلیس کو وہاں سے نکلنے کا حکم ہوا اور اس کے تکبر کے جرم میں اس کو دائمی ذلت کی سزا دی گئی۔ آگے اسی طرح کے متکبرین کے بارے میں فرمایا ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح متکبرین خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْھَا لَا تُفَتَّحُ لَھُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ۴۰ (بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے اعراض کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے) بعینہٖ یہی بات سیدنا مسیحؑ نے فرمائی ہے کہ جس طرح اونٹ سوئی کے ناکے میں نہیں جا سکتا اسی طرح دولت مند خدا کی بہشت میں نہیں جا سکتا۔ دونوں تعبیروں میں صرف یہ فرق ہے کہ قرآن نے اصل جرم 'استکبار' کا حوالہ دیا ہے اور سیدنا مسیحؑ نے علت جرم یعنی دولت کا، جو بالعموم استکبار کا سبب بن جاتی ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شیطان کا اصل جرم استکبار تھا جس کے سبب سے وہ جنت سے نکالا گیا۔ اس وجہ سے جو لوگ اس جرم میں اس کے ساتھی بنیں گے ان کے لیے خدا کی بہشت میں کوئی مقام نہیں ہے۔

انسان کے لیے اصل معرکۂ امتحان

'قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ'۔ ابلیس کو چونکہ ذلت کے ساتھ جنت سے

نکل جانے کا حکم ہوا اس وجہ سے اس کو گمان ہوا کہ اب اس کے لیے سعی و عمل کی کوئی مہلت باقی نہیں رہی ہے۔ اس پر اس نے خدا سے درخواست کی کہ اسے مہلت عطا کی جائے کہ وہ ثابت کر سکے کہ انسان فی الواقع اس شرف کا سزاوار نہیں ہے جو اسے بخشا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مہلت دے دی۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے انسان کی زندگی کا رزار امتحان میں داخل ہوتی ہے۔ شیطان نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اپنا پورا زور اس بات کے لیے لگانے کا منصوبہ بنایا کہ وہ انسان کو نااہل و نالائق ثابت کر دے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں ٹھہری کہ وہ یہ ثابت کرے کہ فی الواقع وہ اس کا اہل ہے۔

کامیابی و ناکامی کا فیصلہ قیامت پر

یہ مہلت سعی و عمل چونکہ انسان کو موت ہی تک حاصل ہے اس وجہ سے شیطان کو بھی ورغلانے اور بہکانے کا موقع صرف انسان کی موت ہی تک ہے۔ مر جانے کے بعد جس طرح انسان پر سعی و عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اسی طرح شیطان کے لیے اس پر زور آزمائی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہے لیکن یہ فیصلہ کہ کون جیتا کون ہارا، قیامت کے دن ہی ہونا ہے اس وجہ سے ابلیس نے مہلت 'اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ' مانگی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی یہ درخواست منظور کرا کے انسان کے شرف و مزیت کے معاملہ کا فیصلہ قیامت پر ملتوی کرا دیا۔ اب وہیں یہ فیصلہ ہوگا کہ انسان اس تاج زریں کا سزاوار ہے یا نہیں؟ اگر وہ سزاوار ٹھہرا تو اس کے لیے جنت کی ابدی نعمتیں ہیں ورنہ جس طرح شیطان دوزخ میں ہوگا اسی طرح انسان بھی دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنائے گا۔

ابلیس کا چیلنج اللہ تعالیٰ کو

'قَالَ فَبِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ' اپنی درخواست منظور کرا لینے کے بعد یہ چیلنج ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو دیا۔ اس نے اپنا اصل حریف اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھا اس وجہ سے چیلنج بھی اللہ تعالیٰ ہی کو دیا۔ گویا اس کارزار میں شیطان کے نقطۂ نظر سے، اصل مقابلہ شیطان اور انسان کے درمیان نہیں بلکہ خدا اور شیطان کے درمیان ہے۔ 'فَبِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ' (بوجہ اس کے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے سجدہ نہ کرنے کے معاملہ میں اپنے رویہ کو بالکل صحیح سمجھا۔ اس کے نزدیک اس کی گمراہی خود کردہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) خدا کردہ ہے۔ گویا خدا نے اسے ڈالا ہی تھا ایسے امتحان میں جس سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے وہ گمراہ ہوا تو اس گمراہی پر نعوذ باللہ خدا ہی نے اس کو مجبور کیا۔

شیطان کی اصل گھات

'صِرَاطِ مُسۡتَقِيۡم' سے مراد توحید کی راہ ہے۔ انسان کی فطرت اور خدا میں براہ راست ربط ہے۔ فطرت کی راہ میں غیر فطری کج پیچ نہ پیدا کر دیے جائیں تو انسان توحید کے سوا کوئی اور راہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اس وجہ سے توحید کو قرآن میں بھی اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی 'صِرَاطِ مُسۡتَقِيۡم' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جب تک انسان اس راہ پر قائم رہتا ہے اس وقت تک، وہ سست رو اور آبلہ پا ہو کر بھی رو بمنزل رہتا ہے اس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اس کے، اگر وہ شرک کے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے تو اصل منزل سے رو گرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے

اس کا سفر بس "ضَلٰلٌ بَعِیْد" ہی کی راہ میں ہوتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کے سبب سے شیطان کو انسان پر پوری فتح حاصل کرنے کا اس وقت تک موقع نہیں ملتا جب تک وہ اس کو توحید کی شاہراہ سے ہٹا کر شرک کی کسی پگڈنڈی پر نہ ڈال دے۔ چنانچہ اس نے اپنے چیلنج میں آشکارا الفاظ میں بتا دیا کہ وہ انسان کی گھات میں توحید کی راہ پر بیٹھے گا اور اس راہ سے اس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

شیطان کے ہمہ جہت حملے کا بیان

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ۔ یہ بیان ہے شیطان کے حملہ کی قوت، وسعت اور ہمہ گیری کا خود اس کی زبان سے۔ وہ ہر جہت، ہر سمت، ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اس کے مشاہدات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کے فکر، فلسفہ، علم، ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اس کی تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف، ادب، آرٹ، لٹریچر ہر چیز میں اپنا زہر گھولے گا، وہ اس کے تہذیب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد برپا کرے گا۔ شیطان کا یہی چیلنج سورۂ بنی اسرائیل میں بدیں الفاظ نقل ہوا ہے۔ قَالَ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ۶۲-۶۵ (ذرا دیکھ تو، یہی ہے وہ جس کو تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے! اگر تو نے قیامت تک کے لیے مجھے مہلت بخشی تو بجز قلیل کے سوا میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ خدا نے فرمایا، چل دور ہو، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے تو تمہارا بھرپور بدلہ جہنم ہے۔ تو ان میں سے جن کو اپنے شور و شغب سے اکھاڑ سکے اکھاڑ لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے مال و اولاد میں ساجھی بن جا اور ان کو اپنے پرفریب وعدوں کے سبز باغ دکھا۔ شیطان کے سارے وعدے ان سے محض دھوکے کی ٹٹی ہیں —— بے شک تجھ کو میرے خاص بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اور تیرا رب اعتماد کے لیے کافی ہے) اس آیت سے شیطان کے پروپیگنڈے کے زور اور اس کی وسعت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے سیاسی ہتھکنڈے بھی استعمال کرے گا۔ البتہ ایک پہلو اس میں تسلی کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان پر یہ اختیار نہیں بخشا کہ وہ اس کے ارادے اور اختیار کو سلب کر سکے۔ انسان کا ارادہ و اختیار بہرحال باقی رہے گا۔ اس وجہ سے اللہ کے جو بندے صراط مستقیم پر قائم رہنے کا عزم کر لیں گے وہ شیطان کی تمام غوغا آرائیوں کے علی الرغم اس پر قائم رہیں گے، اگرچہ اس کے لیے انھیں جان کی بازی کھیلنی پڑے۔

توحید کی اصل روح

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ، کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ تو ان کی اکثریت کو اپنا موحد نہیں پائے گا۔

اس لیے کہ توحید کی اصل حقیقت یہی ہے کہ بندہ اپنی ہر نعمت کو اللہ ہی کا عطیہ، اسی کا فضل جانتے اور اسی کا شکرگزار رہے۔ اگر وہ اس کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دے تو یہ شرک ہے۔ اس مسئلہ پر پیچھے بھی بحثیں گزر چکی ہیں اور آگے بھی اسی سورہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو سامنے آئیں گے۔ اوپر آیت ۱ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

خدا کا دو ٹوک فیصلہ

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ ۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو وہ مہلت تو دے دی جو اس نے مانگی لیکن ساتھ ہی اس نے اس کو ذلیل و خوار کرکے جنت سے نکال بھی دیا اس لیے کہ جنت میں متمردین و متکبرین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کا انجام بھی واضح فرما دیا جو انسانوں اور جنوں میں سے اس کی پیروی کریں گے۔ فرمایا کہ میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔ الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جس طنطنہ اور زور کے ساتھ شیطان نے انسان کو گمراہ کرنے اور ان کی اکثریت کو جیت لینے کے عزم کا اظہار کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی پوری شان بے نیازی اور جبروت کے ساتھ دیا ہے جس سے واضح ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ دو ٹوک ہے، اس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔

وَيَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ۝ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ۝ فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ (۱۹ - ۲۵)

سرگزشتِ آدم و ابلیس کے چند مضمرات

یہ اسی سرگزشت کا آگے کا حصہ بیان ہو رہا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان کو جنت سے نکالنے کے بعد آدمؑ و حواؑ کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی کہ تم چین سے جنت میں رہو، اس کی تمام نعمتوں سے آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھاؤ، بس اتنا خیال رکھنا کہ فلاں درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ تم خود اپنی جان پر ظلم ڈھاؤ گے اور اس جنت سے محروم ہو جاؤ گے۔ شیطان نے یہیں سے آدمؑ پر حملہ کرنے کی راہ نکال لی۔ اس نے آدمؑ و حواؑ کو یہ پٹی پڑھائی کہ اس باغ میں کوئی درخت فائدہ اٹھانے کا ہے تو وہی ہے جس سے تمھیں تمھارے رب نے روک رکھا ہے۔ اس سے تمھیں محض اس وجہ سے روکا گیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھاری زندگی ابدی نہ ہو جائے۔ شیطان نے قسمیں کھا کھا کے آدمؑ و حواؑ کو اپنی خیرخواہی کا یقین دلا دیا۔ بالآخر انھیں اس درخت کا پھل کھا لینے پر آمادہ کر لیا۔ اس کا پھل چکھتے ہی وہ حلۂ جنت سے محروم ہو گئے اور اپنے آپ کو ڈھانکنے کے لیے انھوں نے اپنے اوپر پتے سینے شروع کر دیے۔ اس وقت خدا نے ان کو آواز دی

کہ میں نے تمھیں آگاہ کر دیا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ اپنی دشمنی کا کھلے بندوں اعلان کر چکا ہے۔ اس پر آدمؑ و حوّا کو تنبہ ہُوا۔ انھوں نے فوراً توبہ و استغفار کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمالی لیکن ساتھ ہی آدم و حوّا اور ابلیس سب کو وہاں سے نکلنے کی ہدایت ہُوئی کہ اب تمھارا مستقر زمین ہے، اس میں تم ایک دُوسرے سے آزمائے جاؤ گے، پھر جو اس جنت کا اپنے آپ کو حق دار ثابت کرے گا وہ جنت پائے گا اور جو دوزخ کا سزاوار ٹھہرے گا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

اس سرگزشت کے سنانے سے جن حقائق کا سراغ مقصود ہے ان پر تفصیل سے سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ جو باتیں وہاں زیرِ بحث نہیں آئی ہیں ان کی وضاحت ہم بیان کریں گے۔

یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ الآیۃ، 'شجرہ' پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ سے یہ بات نکلتی ہے کہ پوری جنت کی ہر چیز سے آدمؑ و حوّا کو فائدہ اٹھانے کی آزادی حاصل تھی، صرف ایک درخت سے ان کو روکا گیا تھا لیکن وہی درخت ان کے لیے آزمائش بن گیا۔ شیطان نے اسی شجرِ ممنوعہ کے فوائد و برکات پر ایسی دلفریب تقریر کی کہ آدمؑ اللہ کے عہد پر قائم نہ رہ سکے۔ شیطان کی یہی تکنیک اولادِ آدمؑ کے ساتھ اس دنیا میں بھی ہے۔ اس دُنیا کی ہر چیز انسان کے لیے مباح ہے صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جو ممنوع ہیں۔ شیطان بس انہی چیزوں کو لے کر اپنی اور اپنے کارندوں کی وسوسہ اندازیوں سے لوگوں کو باور کراتا ہے کہ تمھاری ساری کامیابی و ترقی کا راز بس انہی چیزوں کے اندر مضمر ہے جن سے روک دیا گیا ہے۔

ابلیس کو جنت سے نکلنے کے بعد بھی آدمؑ تک رسائی حاصل تھی

'فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا الآیۃ' ہر چند شیطان مردود قرار پا کر جنت سے نکالا جا چکا تھا لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ اس نے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو ورغلانے اور بہکانے کے لیے مہلت حاصل کر لی تھی۔ اس مہلت کے سبب سے معلوم ہوتا ہے، اس کو آدمؑ و حوّا تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی چنانچہ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور وسوسہ اندازی کے لیے آدمؑ کے پاس پہنچ گیا۔

لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا میں 'ل' عاقبت کا ہے۔ شیطان کی کوشش تو، جیسا کہ اس نے اپنے چیلنج میں ظاہر کیا ہے آدمؑ کو کفرانِ نعمت اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا کرنے کی تھی لیکن اس کا انجام چونکہ اس شکل میں ظاہر ہُوا کہ آدمؑ و حوّا حلۂ جنت سے محروم ہو گئے، اس وجہ سے اس کو اس طرح فرمایا گیا ہے گویا شیطان کی کوشش تھی ہی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر۔ حلۂ جنت سے یہ محرومی اشارہ تھی اس بات کی طرف کہ اب آدمؑ کو اپنی ساری ضروریات اپنی سعی و محنت سے فراہم کرنی ہیں۔ اب تک انسان کے لیے ہر چیز کا جو خدا ساز انتظام تھا وہ اس نافرمانی کے بعد ختم ہو گیا۔

آدمؑ کا تصور فرشتوں اور زندگی سے متعلق

'مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ' ابلیس نے آدمؑ کو لالچ دیا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے یا تو وہ فرشتوں کے مرتبے میں آجائیں گے یا انھیں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے سجدہ سے مشرف ہونے کے باوجود آدمؑ فرشتوں کے مرتبہ کو اپنے سے اونچا سمجھتے تھے

نیز وہ یہ جانتے تھے کہ یہ زندگی جو ان کو حاصل ہوئی ہے ابدی زندگی نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شیطان ان کو ان دونوں چیزوں کے نام پر ورغلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتا۔

مقاسمت مبالغہ کے مفہوم کے لیے

وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ، 'مقاسمۃ'، باب مفاعلۃ سے ہے جو عام طور پر تو مشارکت کے مفہوم کے لیے آتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ صرف تکثیر اور مبالغہ کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں 'اقسم' کے بجائے 'قاسم' کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شیطان کو اپنا اعتماد جمانے کے لیے بڑی جد و جہد کرنی پڑی۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے اسے یہ یقین دلانا پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، محض بر بنائے خیر خواہی کہہ رہا ہے اس میں کسی بدنیتی کو دخل نہیں ہے۔

'فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ'، 'یادلاء الدلو' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'دلی فلانا بغرور' کے معنی 'اوقعہ فیما اراد من تغریرہ' اس نے اس کو جس فریب میں مبتلا کرنا چاہا اس میں مبتلا کر دیا، اس کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا، اس کو شیشہ میں اتار لیا۔

ستر پوشی انسان کی فطرت ہے

'فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ'۔ درخت چکھنے کے معنی درخت کا پھل چکھنے کے ہیں۔ عربی میں مضاف کے حذف کر دینے کا اسلوب بہت معروف ہے۔ 'خصف' کے معنی گانٹھنے، گوتھنے، جوڑنے کے ہیں۔ یہ درخت، جیسا کہ اوپر گزرا آدم پر حرام ٹھہرایا گیا تھا اس وجہ سے اس کا پھل کھا لینے کی سزا ان کو یہ ملی کہ وہ حلۂ جنت سے محروم ہو گئے۔ لباس کا بنیادی مقصد چونکہ ستر ہے اور اس سے اچانک محرومی کا اولین اثر انسان پر بے پردگی کے احساس کی شکل میں بطور ایک حادثہ کے پڑتا ہے۔ اس وجہ سے صورت واقعہ کی پوری تصویر سامنے لانے کے لیے اس کو 'بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ 'وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ' کے اسلوب بیان سے اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو اس اچانک حادثے سے آدمؑ و حوا پر طاری ہوئی۔ جوں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہو کر رہ گئے ہیں فوراً انھیں اپنی ستر کی فکر ہوئی اور جس چیز پر ہاتھ پڑ گیا اسی سے ڈھانکنے کی کوشش کی، چنانچہ کوئی چیز نہیں ملی تو باغ کے پتے ہی اپنے اوپر گانٹھنے گوتھنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا احساس انسان کے اندر بالکل فطری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے، شرک انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے، اسی طرح حیا فطرت ہے، بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

'وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا الآیۃ' یہ اشارہ ہے ان تنبیہات کی طرف جو اوپر آیات ۱۷ - ۱۹ میں گزر چکی ہیں۔ آدمؑ پر شیطان کی دشمنی کی نوعیت بھی اچھی طرح واضح کر دی گئی تھی، اس کا اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بھی واضح کر دیا گیا تھا اور خاص اس درخت کی نشان دہی بھی تعین کے ساتھ کر دی گئی تھی جس سے ان کو خطرہ پیش آ سکتا تھا۔

توبہ سے آدمؑ نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی

'قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا' یہ آدمؑ و حوا کی وہ توبہ ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تنبیہ کے بعد کی۔ اس توبہ کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس توبہ سے آدم نے ہاری ہوئی بازی پھر جیت لی۔ ابلیس کے متعلق تو اوپر گزر چکا ہے کہ وہ خدا کی نافرمانی کر کے تنبیہ کے باوجود، اکڑ گیا لیکن آدمؑ و حوا نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا، خدا سے معافی مانگی اور بقرہ میں تصریح گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان پر رحم فرمایا اور اس طرح آدمؑ نے اپنے عمل سے اپنی ذریت کے لیے مثال قائم کی کہ اگر شیطان کے ورغلانے سے انسان کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کے نتائج سے بچنے کی راہ توبہ ہے۔

'قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ الاٰیۃ' اس آیت کے تمام پہلوؤں پر بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے آدمؑ و حوا نے اگرچہ توبہ کر لی تھی اور ان کی توبہ اللہ تعالیٰ نے منظور بھی فرمالی تاہم حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ آدمؑ و حوا جنت سے نکلیں اور اس دنیا میں رہ کر وہ اور ان کی ذریت شیطان اور اس کی ذریت سے مقابلہ کریں، پھر اس میدان میں جو شیطان سے بازی لے جائیں وہ جنت کے وارث ٹھہریں۔ گویا مقابلہ تو وہی رہا جس کا ابلیس نے چیلنج دیا تھا لیکن میدان مقابلہ جنت کے بجائے یہ دُنیا بنا دی گئی اور جنت کو انعام قرار دے دیا گیا، اولادِ آدم میں سے ان خوش بختوں کے لیے جو شیطان کے مقابل میں سُرخ رُو ٹھہریں۔

آدمؑ اور ابلیس دو محارب فریق

'بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ' کے ٹکڑے پر تفصیل سے تفسیر بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ یہاں اسلوب کلام دلیل ہے کہ اس میدان میں آدمؑ و ابلیس کو اتارا ہی دو محارب فریقوں کی حیثیت سے گیا ہے۔ شیطان کو یہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ اولادِ آدم میں سے جن کو جیت سکتا ہے جیت لے اور اولادِ آدمؑ کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ جو جنت کی میراث حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ شیطان کو پچھاڑیں اور جنت جیت لیں۔

نصاریٰ کا مغالطہ

یہاں اس مغالطہ سے متنبہ رہنا ضروری ہے جو نصاریٰ کو پیش آیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان بھی اس دنیا میں شیطان کی طرح لعنتی ہو کر اترا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کفارہ کا ایک خانہ ساز عقیدہ گھڑا ہے۔ قرآن نے بقرہ میں بھی اور یہاں بھی نہایت واضح رہنمائی دی ہے کہ آدمؑ توبہ کے بعد اپنی پچھلی غلطی کے خیازے سے بالکل پاک ہو کر اس دنیا میں آئے ہیں اور اس دنیا میں ان کا بھیجا جانا اس لیے ہوا کہ وہ اور ان کی ذریت شیطان کے مقابل میں اپنے عزم و ایمان سے اپنے آپ کو اس عزت کا حق دار ثابت کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشی اور جو شیطان کے حسد کا باعث ہوئی۔

آدمؑ و اولادِ آدم کے لیے امتحان کے مراحل

'قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ الاٰیۃ' یہ ان مراحل کا بیان ہے جن سے اس دنیا میں آدمؑ و اولادِ آدمؑ کو گزرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان تمام مراحل سے گزر کر تم ہمارے پاس لوٹو گے اور اس وقت ہم تمھیں بتائیں گے کہ تم نے کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے اور اس میدانِ مقابلہ سے تم سرخرو ہو کر لوٹے ہو یا نامراد ہو کر۔

۴- آگے کا مضمون ——— آیات ۲۶-۴۳

آگے کی آیات میں پہلے ان باتوں کی یاددہانی کی گئی ہے جن سے، شیطان کی دشمنی کے پیش نظر، اولادِ آدمؑ کو شروع ہی میں آگاہ کر دیا گیا تھا اور جن کا اہتمام پیش آنے والے امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے ہر ابن آدمؑ کا فرض تھا تاکہ وہ اس افتاد سے محفوظ رہیں جو ان کے دشمن ازلی کے ہاتھوں ان کے باپ کو پیش آئی۔

اس کے بعد قریش کی طرف، جو اس سورہ میں مخاطب ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے ان ہدایات کو نظر انداز کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان نے ان کو بھی ورغلا کر اسی طرح ان کے کپڑے اتروا لیے ہیں جس طرح ان کے ماں باپ ——— آدمؑ و حوّا ——— کے اتروا لیے تھے لیکن یہ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے حیائی انھوں نے شیطان کی پیروی میں نہیں بلکہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اختیار کی ہے اور دلیل اس کی ان کے پاس صرف یہ ہے کہ یہ طریقہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے وراثت میں پایا ہے۔

اس کے بعد اس روح اور اصل الاصول کا حوالہ دیا جو تمام خدائی احکام میں لازماً ملحوظ ہے اور جو خدائی احکام اور شیطانی بدعات میں امتیاز کے لیے عقلی و فطری کسوٹی ہے۔ پھر اس کسوٹی پر پرکھ کر بتایا کہ آج جن ابلیسی بدعات کو قریش خدا کا دین بتا رہے ہیں ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ باتیں انھوں نے شیطان کی رہنمائی میں خود ایجاد کی ہیں اور منسوب ان کو خدا کی طرف کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی دی کہ انھوں نے یہ روش نہ بدلی تو یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جن سے ان کی ہم مشرب قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کا حوالہ دیا جو آدمؑ کو اس رزم گاہ امتحان میں اتارتے وقت ان کی ذرّیت میں انبیا و رسل کا سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کرنے کے لیے فرمایا تھا اور یہ آگاہی دی تھی کہ جو ان انبیا کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے فتنوں سے امان میں رہیں گے اور جو ان کو جھٹلائیں گے وہ اپنی مہلت حیات پوری کر کے دوزخ میں پڑیں گے۔

اس کے بعد مکذبین انبیا اور متبعین انبیا دونوں گروہوں کے احوال آخرت کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے۔ پہلے گروہ کے متعلق بتایا ہے کہ جب دوزخ میں سب اگلے پچھلے اکٹھے ہوں گے تو آپس میں جوتیوں میں دال بٹے گی اور ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔ اخلاف جن بڑوں کی پیروی پر آج نازاں ہیں، کل ان کو گالیاں دیں گے کہ انھوں نے ہماری راہ ماری، یہ نہ گمراہ کرتے تو ہم ہدایت پر ہوتے۔ اکابر اخلاف کو گالیاں دیں گے کہ یہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے ہدایت کی راہ اختیار نہ کی، اس میں ہمارا کیا قصور۔ دوسرے گروہ کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ جنت میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے خوش خوش

بیٹھے ہوں گے، کسی نفرت و ملامت کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوگا، مبارک سلامت کے تحائف کے مبادلے ہو رہے ہوں گے اور ہر گوشے میں خدا کے ترانۂ حمد اور انبیاء کے احسانات کے اعتراف سے محفل گونج رہی ہوگی ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ آیات ۲۶-۴۳
وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ
يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ
وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ
لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا
عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ
بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ
رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۟ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِيْقًا هَدٰى
وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ
خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ ع ۳ ۱۰
اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٣٢﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا
وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾
وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٤﴾ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَاۤ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ
نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ
قَالُوْۤا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا
وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾ قَالَ ادْخُلُوْا
فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ
قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۚ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَقَالَتْ
اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
ع بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ
الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ
مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا
اِلَّا وُسْعَهَاۤ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ
وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ
لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْۤا اَنْ
الثلثة تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

ترجمۂ آیات ۲۶-۴۳

اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہارے لیے ستر پوش بھی ہے اور زینت بھی۔ مزید برآں تقویٰ کا لباس ہے جو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ اللہ کی آیات میں سے ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ اے بنی آدم! شیطان تمہیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے، جس طرح اس نے تمہارے باپ ماں کو جنت سے نکلوا چھوڑا ان کے لباس اتروا کر کہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کردے، وہ اور اس کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔ ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان سے محروم ہیں۔ ۲۶-۲۷

اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں، کہتے ہیں، ہم نے تو اسی طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو، اللہ کبھی

بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں۔ کہہ دو، کہ اللہ نے تو ہر معاملے میں قسط کا حکم دیا ہے۔ اور یہ کہ ہر مسجد کے پاس اپنا رُخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے جس طرح اس نے تمھارا آغاز کیا اسی طرح تم لوٹو گے۔ ایک گروہ کو اس نے ہدایت بخشی اور ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ انھوں نے اللہ کے ماسوا شیاطین کو اپنا رفیق بنایا اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو۔ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟ کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ کہہ دو، میرے رب نے حرام تو بس بے حیائیوں کو ٹھہرایا ہے، خواہ کھلی ہوں خواہ پوشیدہ۔ اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ کا کسی چیز کو ساجھی ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر کسی ایسی بات کا بہتان لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ اور ہر امت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے تو جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۲۸-۳۴

اے بنی آدم! اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور جو میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہی دوزخ والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھیں یا اس کی آیات کو جھٹلائیں۔ ان لوگوں کو ان کے نوشتہ کا حصہ پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کو قبض کرنے آئیں گے تو اُن سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے اور یہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ لاریب وہ کفر میں رہے۔ حکم ہوگا، جاؤ، پڑو دوزخ میں ان امتوں کے ساتھ جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزریں۔ جب جب کوئی امت داخل ہوگی اپنی ساتھی امت پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس میں اکٹھے ہولیں گے، ان کے پچھلے اگلوں کے بارے میں کہیں گے، اے ہمارے رب! یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا تو ان کو دہرا عذاب نار دیجیو۔ ارشاد ہوگا تم سب کے لیے دہرا ہے، پر تم جانتے نہیں۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے، تم کو بھی تو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی تو تم بھی اپنے کیے کی پاداش میں عذاب چکھو۔ ۳۵ - ۳۹

بے شک جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے منہ موڑا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں نہیں داخل ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ سما جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ان کے لیے دوزخ ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے — ہم کسی جان

پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے —— وہی جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم کھینچ لیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اس چیز کی ہم کو ہدایت بخشی، اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی تو ہم تو ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے۔ اور ان کو پیغام دیا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث ٹھہرائے گئے ہو۔ ۴۰-۴۳

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۶-۲۷)

لباس سے سترپوشی اور زینت دونوں چیزیں مقصود ہیں

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا۔ 'ریش' کا لفظ چڑیوں کے پروں کے لیے بھی آتا ہے اور اس سے زیب و زینت کا لباس بھی مراد ہوتا ہے۔ لباس کا اولین مقصد تو سترپوشی ہے لیکن زیب و زینت بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے۔ قدرت نے جو چیز بھی بنائی ہے اس میں مختلف پہلو ملحوظ رکھے ہیں اور یہ سارے ہی پہلو ہماری فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ سترپوشی کے لیے تو بھگوا یا لنگوٹی بھی کافی تھی لیکن قدرت نے اتمامِ نعمت کے طور پر ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا جو سترپوش بھی ہو، سردی اور گرمی سے بھی ہماری حفاظت کرے اور اس سے ہماری شخصیت، ہمارے وقار، ہمارے حُسن اور ہماری شان میں بھی اضافہ ہو۔ ان میں سے کوئی مقصد بھی بجائے خود معیوب نہیں ہے البتہ افراط یا تفریط سے جس طرح ہر چیز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن نے زینت کو مقاصدِ لباس میں داخل کر کے اس جوگیانہ تصور کی نفی کر دی جو لباس کو ایک آلائش اور عریانی یا نیم عریانی کو مذہبی تقدس کا درجہ دیتا ہے۔

باطنی لباس تقویٰ ہے

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ یعنی ظاہری لباس کے ساتھ ساتھ ایک باطنی لباس بھی انسان کو عطا

ہوا ہے اور وہ تقویٰ کا لباس ہے جو اس ظاہری لباس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے کہ درحقیقت یہ تقویٰ کا لباس ہی ہے جو ظاہری لباس کی بھی حقیقی افادیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو آدمی اس ظاہری لباس کو اختیار کرتا ہی ہے اپنے اسی باطنی لباس کی تحریک سے۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی کپڑے پہن کر بھی ننگا ہی رہتا ہے اور اس کے لباس سے اس کے وقار میں اضافہ ہونے کے بجائے یا تو اس کی رعونت میں اضافہ ہوتا ہے یا اس کی بدقوارگی میں۔ یہ لباس تقویٰ، حیا، خشیتِ الٰہی، اور احساس عبدیت سے بنتا ہے اور جس کے قامت پر اللہ اپنی عنایت کی یہ ردا ڈال دیتا ہے دیکھنے کے قابل وقار و جمال اسی کا ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کے لباس میں مقدس فرشتہ ہوتا ہے جو بھی اس کو دیکھتا ہے بے تحاشا مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ پکار اٹھتا ہے۔

ان باتوں کی یاد دہانی جن کی ہدایت ابتدا ہی میں آدم کو کی گئی تھی

'ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ' یہ اوپر والی بات جس کی یاد دہانی کی گئی ہے ان باتوں میں سے ہے جن کی ہدایت اولادِ آدم کو اسی وقت کر دی گئی تھی جب آدم کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا اور مقصود اس کے حوالہ سے یہ ہے کہ قریش متنبہ ہوں کہ شیطان نے جس فتنے میں آدم کو مبتلا کیا اسی طرح کے فتنے میں اس نے انھیں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدمؑ کو اس دنیا میں بساتے وقت آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو جو ہدایات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھیں ان میں سے بعض کا حوالہ قرآن نے دیا ہے۔ مثلاً بقرہ میں ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸ (ہم نے کہا یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمھارے پاس میری کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم) بعینہٖ یہی مضمون آگے اسی سورہ میں آیت ۳۵ میں آ رہا ہے يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ' (اے بنی آدم اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں تمھیں میری آیات سناتے ہوئے تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کی، اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ ان کو غم لاحق ہوگا) ہمارے نزدیک یہاں بھی انھی باتوں کا حوالہ ہے جن کی ہدایت ابتدا ہی میں اولادِ آدم کو کی گئی تھی تاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے آپ کو شیطان کے اس قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکیں جس قسم کے فتنے میں اس نے آدمؑ و حوّا کو ڈال دیا۔ یہ انھی باتوں کی یاد دہانی اب قریش کو کی جا رہی ہے تاکہ انھیں خبردار کیا جائے کہ وہ بھی شیطان کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں اور اس نے وہی داؤں ان پر بھی چلایا ہے جو آدم پر چلایا تھا۔

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کے خطاب

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ' کے خطاب کی بلاغت پر بھی یہاں نظر رہے۔ باپ کی زندگی کے حوادث و تجربات اولاد کے لیے سب سے زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اس کی سرگزشت کسی دوسرے کی کہانی نہیں بلکہ اپنی ہی حکایت ہوتی ہے۔ باپ کے دوستوں سے دوستی، اس کے دشمنوں سے دشمنی باوفا اولاد خاندان کی ناقابلِ فراموش روایت کی طرح محفوظ رکھتی ہے۔ اخلاف اس کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے بعد والوں کی طرف اس کو منتقل کرتے اور برابر

منتقل کرتے رہنے کی وصیت کرتے ہیں۔ اہل عرب میں تو یہ روایت اتنی محبوب رہی ہے کہ اس میں حق و باطل کا امتیاز بھی باقی نہیں رہا تھا۔ باپ دادا کا دشمن بہرحال پشتہا پشت دشمن ہی سمجھا جاتا اگرچہ اس کی دشمنی برحق ہی کیوں نہ رہی ہو۔ پھر کس قدر حیف کی بات ہے کہ آدم کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کی اس دشمنی کو بھول جائے جو سراسر کینہ اور حسد پر مبنی تھی، جو مخفی نہیں بلکہ بالکل علانیہ تھی اور جو صرف مخصوص آدم و حوا کے ساتھ ہی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ان کی تمام ذریت کے ساتھ تھی۔ پھر معاملہ صرف بھول جانے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اولاد کی ناخلفی، ناہنجاری اور نابکاری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کتنے ہیں جو اس دشمن اور اس کے ساتھیوں ہی کو اپنا دوست، خیرخواہ اور معتمد بنائے بیٹھے ہیں اور اس کے کہے پر ٹھیک ٹھیک اپنے لیے انہی تباہیوں کے گڑھے کھود رہے ہیں جن میں اس نے آدمؑ کو گرانا چاہا تھا اور وہ اس میں گر چکے تھے، اگر اللہ کی رحمت نے ان کو بچایا نہ ہوتا —— قرآن کی بلاغت بیان کے قربان جائیے کہ صرف 'یا بنی آدم' کے خطاب کے دو لفظوں کے اندر اس نے یہ سارے مضمرات محفوظ کر دیے ہیں۔ آدمؑ کا جو غیور و باوفا بیٹا اس خطاب کے ساتھ قرآن کی ان یاددہانیوں کو سنتا ہے اس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوشِ حمیت و غیرت سے پھڑک اٹھتی ہے۔ صرف بے غیرت اور ناخلف ہی ہیں جو اس خطاب کے بعد بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

تمدن میں فساد پیدا کرنے کے لیے شیطان کی ایک خاص چال

'یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا سَوۡاٰتِہِمَا' بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انہی یاددہانیوں میں سے ہے جو ابتدا ہی میں اولادِ آدم کو کی گئی تھیں۔ اور اس کے اسلوب بیان سے شیطان کی اس چال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو وہ بنی آدم کے تمدن کو برباد کرنے اور بالآخران کو خدا کی نعمت سے محروم کر کے ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے پہلے لوگوں کو اس لباس تقویٰ و خشیت سے محروم کرتا ہے جو اللہ نے بنی آدم کے لیے اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک تشریف باطنی کی حیثیت سے اتارا ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ جب یہ باطنی جامہ اتر جاتا ہے تو وہ حیا ختم ہو جاتی ہے جو اس ظاہری لباس کی اصل محرک ہے۔ پھر یہ ظاہری لباس ایک بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے۔ بے حیائی صنفی اعضا میں، جن کا چھپانا تقاضائے فطرت ہے، عریاں ہونے کے لیے تڑپ پیدا کرتی ہے، پھر فیشن اس کو سہارا دیتا ہے اور وہ لباس کی تراش خراش میں نت نئی اختراعات سے ایسے ایسے اسلوب پیدا کرتا ہے کہ آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کپڑے پہن کر بھی، لباس کے بنیادی مقصد یعنی ستر پوشی کے اعتبار سے، گویا ننگے ہی رہتے ہیں۔ پھر لباس میں صرف زینت اور آرائش کا پہلو باقی رہ جاتا ہے اور اس میں بھی اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ بے حیائی زیادہ سے زیادہ دلکش زاویہ سے نمایاں ہو۔ پھر آہستہ آہستہ عقل اس طرح ماؤف ہو جاتی ہے کہ عریانی تہذیب کا نام پاتی ہے اور ساتر لباس وحشت و دقیانوسیت کا۔ پھر پڑھے لکھے شیاطین اٹھتے ہیں اور تاریخ کی روشنی میں یہ فلسفہ پیدا

کرتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو عُریانی ہی ہے۔ لباس تو اس نے رسوم و رواج کی پابندیوں کے تحت اختیار کیا ہے۔ یہ مرحلہ ہے جب دیدوں کا پانی مرجاتا ہے اور پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہوجاتا ہے۔ پھر یہ بے حیا معاشرہ سزاوار ہوتا ہے کہ قدرت اس کے وجود سے زمین کو پاک کرکے ان کی جگہ دوسروں کو لائے اور دیکھے کہ وہ کیسا عمل کرتے ہیں۔

شیطان کے بھیس ان گنت اور اس کے چرتر بے شمار ہیں

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ یہ شیطان اور اس کے جتھے کی چالاکی، کیادی اور فتنہ سامانی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے حملے کے راستے اور ان کے ظہور کے بھیس اتنے بے شمار ہیں کہ تم ان سارے راستوں پر نہ پہرا بٹھا سکتے، نہ ہر بھیس میں ان کو پہچان ہی سکتے۔ اس کے لشکر میں جن بھی ہیں اور انسان بھی، وہ وہاں سے گھات لگائیں گے جہاں سے تم دیکھ نہیں سکو گے اور تمہارے لیے وہ وہ بہروپ بھریں گے کہ تم پہچان نہ سکو گے۔ تم انھیں دوست، ناصح، خیرسگال، مرشد، لیڈر اور نہ جانے کیا کیا سمجھو گے اور وہ تمہارے دین و ایمان کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ تم گمان کرو گے کہ وہ تمہارے لیے تہذیب و ترقی کی راہیں کھول رہے ہیں لیکن وہ تم کو وہاں لے جاکر ماریں گے جہاں پانی بھی نہ پاؤ گے۔ ان کو تمہارے باطن کی ساری کمزوریں معلوم ہوں گی اور وہ اپنی اندرونی وسوسہ اندازیوں سے بھی تم کو شکار کرنے کی کوشش کریں گے اور اپنی ظاہری عشوہ گریوں سے بھی تم پر اپنے جال پھینکیں گے —— مطلب یہ ہے کہ اس دشمن کو معمولی دشمن نہ سمجھنا، ہر وقت اس سے چوکنے رہنا۔

شیطان کے فتنوں سے واحد امان

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ شیطان اور اس کے جتھے کے حملوں سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتائی ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ ایمان پر مضبوطی سے جمے رہنا۔ ایمان سے مراد اللہ اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت پر ایمان ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اس دنیا میں اتارتے وقت شیطان کے حملوں سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ بتائی تھی کہ جو میری بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸۔ بقرہ (ہم نے کہا کہ یہاں سے سب اترو تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان کے لیے کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم) زیر بحث ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین کو مسلط ہونے کا موقع انہی پر دیتا ہے جو خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی گھر کے مانند ہوتے ہیں اس وجہ سے شیطان ان میں ڈیرے جما لیتے ہیں، خانۂ خالی را دیو مے گیرد۔ اس کے برعکس جن کے دل خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے آباد ہوتے ہیں ان کے اندر شیاطین کو گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی بات دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوئی ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۳۶۔ زخرف (اور جو خدائے رحمان کی یاد سے بے پروا ہو جاتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہی اس کا

ساتھی بن جاتا ہے)

وَاِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً قَالُوۡا وَجَدۡنَا عَلَیۡہَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِہَا ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ
بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَاَقِیۡمُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ
وَّادۡعُوۡہُ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ؕ کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ۝ فَرِیۡقًا ہَدٰی وَفَرِیۡقًا حَقَّ عَلَیۡہِمُ الضَّلٰلَۃُ ؕ
اِنَّہُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَیَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ (۲۸-۳۰)

قریش پر شیطان کا جال

ان یاد دہانیوں کو سنانے کے بعد جو اولادِ آدم کو کی گئی تھیں اب یہ قریش اور عربوں کا حال سنایا جا رہا ہے کہ کس طرح شیطان نے ان کو جکمہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے اور وہ اس کو اپنا دوست بنائے بیٹھے ہیں حالانکہ اس نے ان کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا ہے جس طرح کا معاملہ ان کے باپ ماں — آدمؑ و حوا کے ساتھ کیا تھا۔ آدم و حوا کے کپڑے اس نے جنت میں اتروا لیے تھے، آدم کے ان بیٹوں اور حوا کی ان بیٹیوں کے کپڑے اس نے حرم الٰہی میں اتروا لیے ہیں اور ستم یہ ہے کہ یہ اس کو اپنے باپ دادا کی روایت اور خدا کی ہدایت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خدا کی ہدایت نہیں بلکہ شیطان کا فتنہ ہے اور اس طرح اس نے یہ چاہا ہے کہ جس طرح اس نے آدم کو جنت سے نکلوایا اسی طرح ان کو ننگا کر کے اس حرم پاک سے بے دخل کرائے۔[1]

طواف عریاں کا فلسفہ اور اس کے مہلک اثرات

وَاِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً قَالُوۡا وَجَدۡنَا عَلَیۡہَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِہَا، فاحشۃ اس کھلی ہوئی بے حیائی کو کہتے ہیں جس کو اندھوں اور احمقوں کے سوا سب بے حیائی قرار دیں۔ ہمارے مفسرین نے یہاں اس سے وہ بدعت مراد لی ہے جو خانہ کعبہ کا ننگے ہو کر طواف کرنے کی عرب جاہلیت میں رواج پا گئی تھی۔ مفسرین کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عرب جاہلیت کی بے حیائیوں میں سے یہی بے حیائی ہے جس کو وہ، جیسا کہ وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِہَا کے الفاظ سے واضح ہے، حکم شریعت کا درجہ دیتے تھے۔ اگرچہ قریش خود تو اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھے ہوئے تھے لیکن دوسروں کے لیے، مرد ہوں یا عورتیں، انھوں نے اس عریانی کو عبادت قرار دے رکھا تھا۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قریش سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں خانہ کعبہ کا طواف نہ کریں۔ یا تو وہ قریش میں سے کسی سے اس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں ورنہ ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے آلائش دنیا اور زینت دنیا میں داخل ہیں جس سے اس عبادت کی حرمت کو بٹہ لگ جاتا ہے۔ یہ اسی طرح کی عیاشی اور نفس پروری کی ایک مکروہ شکل تھی جس کی بے شمار مثالیں مندروں اور کلیساؤں کی تاریخ میں ملتی ہیں اور جو تمام تر ان کے پروہتوں اور پجاریوں کی نفسانیت سے وجود میں آئیں لیکن ان کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔ مزارات کے مجاوروں نے بھی اس معاملے میں شیطان کا بہت ہاتھ بٹایا ہے۔ اس بدعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار

---

[1] یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ بیت اللہ، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب تفسیر سورۂ کوثر میں تفصیل سے ثابت کیا ہے، اس دنیا میں حوضِ کوثر کا مجاز ہے۔

کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولاں گاہ بن گئی اور حرم کی نظر بازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں بھی نمایاں ہوئیں جن کو پڑھیے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا، کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا لیکن کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ ہے اس حقیقت کا ایک پہلو جو اوپر اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ میں بیان ہوئی ہے۔

خدا کے احکام کی شناخت کے لیے کسوٹی

'قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یہ تردید ہے اوپر والی بات کی کہ تم اس بے حیائی اور بے شرمی کو خدا کا حکم قرار دیتے ہو، خدا کبھی بے حیائی و بے شرمی کا حکم نہیں دیتا۔ خدا کے احکام، اس کی صفات اور انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ جب اس کی صفات میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو اس بے حیائی کو گوارا کر سکے تو وہ اس کا حکم کس طرح دے سکتا ہے؟ پھر جب اس نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ بدوِ شعور سے لے کر مرتے دم تک وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کے سامنے عریاں ہو تو وہ اسی انسان کو یہ حکم کس طرح دے سکتا ہے کہ وہ عین اس کے حرم میں ساری خدائی کے سامنے ننگا ہو جائے اور ننگے ہو کر اس کے آگے پھیرے لگائے! آخر خدا اور اس کی پاکیزہ صفات، انسان اور اس کی سلیم فطرت کے ساتھ اس بیہودہ حرکت کا کیا جوڑ ہے؟ خدا پر ایسی بے ہودہ تہمت کیوں لگاتے ہو؟ 'مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' یعنی ایسی بات جو بالکل بے سند اور بے دلیل ہے۔

'قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ' لفظ 'قسط' پر پوری تفصیل کے ساتھ، ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ 'قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ' ہے اس وجہ سے بندوں کو اس نے جو حکم بھی دیا ہے سراسر قسط پر مبنی ہے۔ 'قسط' ایک جامع حقیقت ہے جو تمام شریعت الٰہی کی روح ہے۔ یعنی ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک نقطۂ عدل و اعتدال کا اہتمام۔ اس کا تعلق زندگی کے کسی ایک ہی پہلو سے نہیں ہے بلکہ ہر پہلو سے ہے، عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، اخلاق میں، معیشت میں، معاشرت میں، قانون میں، سیاست میں، غرض ہر شعبۂ زندگی میں یہی وہ اصل الاصول ہے جس پر شریعتِ الٰہی مبنی ہے۔ موقع و محل کی تبدیلی سے اس کی تعبیریں بدل بدل جائیں گی لیکن اصل حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ مثلاً دیکھیے اسی قسط پر یہاں 'اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ' کو مبنی کیا اس لیے کہ جب خالق و مالک خدا ہے تو یہ قسط کے خلاف ہے کہ عبادت کی پیشانی کسی اور کے سجدے سے آلودہ ہو، اسی پر 'كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ' کو مبنی کیا اس لیے کہ یہ قسط کا تقاضا ہے کہ جب اس نے پیدا کیا، پرورش کے اسباب و وسائل فراہم کیے، خیر و شر کا امتیاز بخشا تو وہ حساب و کتاب بھی کرے اور جزا و سزا بھی دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ قسط نہیں بلکہ ظلم وجود ہو گا۔ پھر دیکھیے آگے چل کر اسی پر 'خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ' اور 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا' کو مبنی کیا۔ یعنی یہ بات قسط کے خلاف ہے کہ خدا کی عبادت کے لیے آدمی لباس کو ترک کر دے یا کھانے پینے کی لذات سے دستبردار ہو جائے۔

قسط یہ ہے کہ آدمی پہنے بھی، کھائے پیے بھی، البتہ کسی چیز میں اسراف نہ کرے، اسراف قسط کے خلاف ہے۔ الغرض یہ قسط ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جو شخص حکمتِ دین سے آشنا ہو وہ اس پر پرکھ کے جان سکتا ہے کہ کون سی بات خدا کی ہے اور کون سی بات خدا کی نہیں ہے۔

مسجد اپنی فطرت ہی سے خدا کے لیے خاص ہوتی ہے

'وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ' ، 'قسط' ایک حقیقت جامعہ ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، اور اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے حقوق میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ عبادت صرف خدا کا حق ہے، کوئی اور عبادت کا سزاوار نہیں ہے اس وجہ سے نہ کسی غیر اللہ کے لیے مسجد بن سکتی ہے نہ کسی مسجد میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رخ کرنے کی نیت کی جا سکتی ہے۔ سجدہ خدا ہی کے لیے زیبا ہے اس وجہ سے مسجد اپنی فطرت کے اعتبار سے خدا ہی کے لیے خاص ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے 'وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا' (جن: اور یہ کہ مسجدیں صرف اللہ ہی کے لیے ہیں تو تم ان میں اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو) بعینہٖ یہی بات آیت زیر بحث میں فرمائی کہ ہر مسجد صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے، اس وجہ سے اپنے رُخ اسی کی طرف کرو۔ 'اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ' کے بعد 'اِلَى اللّٰهِ وَحْدَهٗ' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں اس لیے کہ بعد کے الفاظ 'وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ' کے الفاظ اس محذوف کا حق بھی ادا کر رہے ہیں اور اس حقیقت کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ خدا کی عبادت صرف عبادت ہی کے اخلاص کی مقتضی نہیں ہے بلکہ وہ اطاعت کے اخلاص کو بھی مقتضی ہے۔

دریا بکوزہ

'كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ' یہ توحید کے مضمون کی تاکید و توثیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کی عبادت اور خدا ہی کی اطاعت اس لیے کرو کہ جس خدا نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر اسی کی طرف لوٹنا ہے اور جس طرح اس دنیا میں تنہا آئے ہو اسی طرح تنہا ہی اس کی طرف لوٹو گے بھی، تمہارے مزعومہ شریکوں اور سفارشیوں میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ قرآن کی اس بلاغت کے قربان جائیے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اس نے آخرت اور توحید دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان فرما دی۔

'فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ الاٰيه' مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی اور اللہ نے ایک گروہ کو اس حقیقت پر ایمان لانے کی توفیق بھی دی ہے لیکن ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی۔ اس نے شیاطین کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور یہ شیاطین ان کو انہی گمراہیوں میں پھنسائے ہوئے ہیں جن میں ابلیس نے ان کو پھنسانے کی دھمکی دی تھی لیکن اپنی شامتِ اعمال سے گمان یہ کیے بیٹھے ہیں کہ وہ راہ ہدایت پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی اس جہالت سے باز نہ آئے تو لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو ایسے شامت زدوں کے لیے مقدر ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

المسرفين ۝ قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده والطيبت من الرزق ۚ قل هي
للذين امنوا في الحيوة الدنيا خالصة يوم القيمة ۚ كذلك نفصل الايت لقوم يعلمون ۝ قل
انما حرم ربي الفواحش ما ظهر منها وما بطن والاثم والبغي بغير الحق وان تشركوا بالله ما لم
ينزل به سلطنا وان تقولوا على الله ما لا تعلمون ۝ ولكل امة اجل ۚ فاذا جاء اجلهم
لا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون (۳۱ - ۳۴)

'يبني ادم خذوا زينتكم عند كل مسجد الاية' 'يبني ادم' کا خطاب قریش اور عربوں ہی سے ہے۔ اس میں آدمؑ کی طرف نسبت میں بلاغت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ اس سے آدمؑ و شیطان کی اس سرگزشت کی یاددہانی ہوتی ہے جو تمام نسلِ آدمؑ کی مشترک سرگزشت ہے اور جو ہر ابن آدم کو یہ سبق دیتی ہے کہ شیطان ان کا ابدی دشمن ہے جس کو دوست بنانا اور جس کے کہے پر چلنا اپنے اور اپنے باپ کے دشمن کو دوست بنانا ہے۔

اس جوگ کی نفی جو عریانی کو تقویٰ ٹھہرائے

'خذوا زينتكم' میں زینت سے مراد لباس فاخرہ نہیں بلکہ مجرد لباس ہے۔ لباس کو زینت کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ بیان یہ ہے کہ طواف میں عریانی اختیار کرنے کا فلسفہ یہی تراشا گیا تھا کہ لباس زیب و زینت میں داخل ہے اور زیب و زینت اس عبادت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ حج اور احرام میں فی الجملہ زہد و درویشی تو حضرت ابراہیمؑ کے عہد ہی سے چلی آ رہی ہے اور یہ حج کی خصوصیات میں سے ہے لیکن عربوں نے دورِ جاہلیت میں جہاں اور بہت سی بدعات ایجاد کیں وہیں یہ بدعت بھی ایجاد کر ڈالی کہ احرام کی سادگی اور درویشی کو عورتوں اور مردوں سب کے لیے عریانی کے حد تک پہنچا دیا۔ قرآن نے اسی بدعت کی اصلاح کی۔ فرمایا کہ یہ عریانی بے حیائی ہے۔ اپنے لباس ہر مسجد کی حاضری کے وقت پہنو۔ جس طرح کوئی مسجد غیر اللہ کے لیے نہیں ہو سکتی اسی طرح کوئی مسجد ایسی نہیں ہو سکتی جس کی حاضری کے لیے یہ شرط ٹھہرا لی جائے کہ آدمی وہاں کپڑے اتار کر حاضر ہو۔ 'كل مسجد' فرما کر اس حکم کو عام کر دیا کہ حرم اور غیر حرم کی تخصیص نہ رہ جائے۔ یہ اس جوگ اور رہبانیت کی کلی نفی ہے جو عریانی کو تقربِ الٰہی اور وصول الی اللہ کا ذریعہ ٹھہراتی ہے۔

افراط اور تفریط دونوں تقویٰ کے خلاف ہیں

'كلوا واشربوا ولا تسرفوا ان الله لا يحب المسرفين' جس طرح لباس تقویٰ اور دینداری کے خلاف نہیں ہے اسی طرح کھانا پینا اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی دینداری کے خلاف نہیں ہے۔ دینداری اور تقویٰ کے خلاف جو چیز ہے وہ اسراف ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز اس 'قسط' کے خلاف ہے جو تمام شریعت اور تمام احکامِ الٰہی کی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، روح ہے۔ اللہ تعالیٰ 'قائم بالقسط' ہے اس وجہ سے وہ 'مقسطين' یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، 'مسرفين' یعنی عدل و اعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ بے اعتدالی افراط کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے، تفریط کی نوعیت کی بھی، اور یہ دونوں ہی باتیں خدا کی پسند کے خلاف ہیں۔ نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے ہی

کو مقصود بنا لے اور رات دن اسی کی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ ان چیزوں کو راہبوں اور جوگیوں کی طرح تیاگ دے۔ تبذیر اور تفریط دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں، خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند فرماتا ہے۔

اصل نقطۂ اعتدال

یہ سوال کہ ان چیزوں میں نقطۂ عدل و اعتدال کیا ہے اور حد اسراف کیا ہے انسان کی عقل سلیم اور فطرت سلیم پر چھوڑا گیا ہے اس لیے کہ اس کی کوئی قانونی حد بندی ممکن نہیں ہے۔ اشخاص اور حالات کے اعتبار سے اس میں فرق بھی ہو سکتا ہے۔ ایک غنی اور ایک فقیر دونوں کے لیے کوئی ایک معیار مقرر نہیں ہو سکتا ہے۔ تاہم ہر غنی سے اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے اس میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں اس وجہ سے اس کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا تو مباح ہے لیکن اسراف و تبذیر جائز نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مسرفین کو دوست نہیں رکھتا۔ 'دوست نہیں رکھتا' کے الفاظ معمولی نہیں ہیں اس لیے کہ خدا جن کو دوست نہیں رکھتا لازماً وہ اس کے نزدیک مبغوض ہیں۔

خدا کی نعمتوں پر کوئی پابندی خدا ہی عائد کر سکتا ہے

'قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ' یہ سوال تردید اور انکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عطا کیے ہوئے لباس اور پاکیزہ رزق کو تم نے کس کے کہنے سے حرام ٹھہرایا ہے؟ ان چیزوں کا عطا کرنے والا تو خدا ہے تو ان کو حرام ٹھہرانے کا حق کسی دوسرے کو کہاں سے حاصل ہوا؟ 'الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ' یہاں بطور دلیل وارد ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو خود زبانِ حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ عطا کرنے والے نے یہ بندوں کے برتنے کے لیے عطا فرمائی ہیں تو ان پر کوئی ناروا پابندی عاید کرنے کے کیا معنی؟ ان پر کوئی پابندی تو ان کا عطا کرنے والا ہی عاید کر سکتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تمھارے پاس کوئی سند یا دلیل ہو۔

اللہ کی نعمتوں کے جائز حقدار اہلِ ایمان ہی ہیں

'قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ الآیہ' اس ٹکڑے میں حذف کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں وضاحت کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ متقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف پر دلیل ہو جاتا ہے۔ یہاں 'لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' اور 'خَالِصَةً' کے مقابل الفاظ حذف ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں اس دنیا میں بھی اصلاً اہلِ ایمان ہی کا حق ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں کافروں کو بھی شریک کر دیا ہے، رہا آخرت کا معاملہ تو وہاں یہ سو فی صدی اہلِ ایمان ہی کا حصہ ہوں گی، کافروں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، البتہ دنیا میں انھوں نے ان سے جو فائدہ اٹھایا اس کی جواب دہی انھیں کرنی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ایمان اور دینداری کے منافی نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو مایا کا جال سمجھتے ہیں اور ان سے دستبرداری کو تقرب الٰہی کی شرط ٹھہراتے ہیں، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، اللہ کے شکر گزار رہو، اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور اللہ اور

اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے رہو۔

'کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ' بطور امتنان اور 'لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ' میں فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔

خدا کی حرام ٹھہرائی ہوئی اصل چیزیں

'قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ الایۃ' اب یہ بتایا کہ خدا نے حرام کیا چیزیں قرار دی ہیں اور ان کے بتانے کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جو چیزیں خدا نے حرام ٹھہرائی ہیں وہ تو تم نے نہ صرف جائز بلکہ دین بنا رکھی ہیں اور اچھی بھلی جائز و طیب چیزوں کو حرام کر کے دینداری کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہو۔

ان حرام چیزوں میں 'فواحش' ہیں، عام اس سے کہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ ظاہری اور باطنی کی وضاحت انعام آیت ۱۵۱ کے تحت ہو چکی ہے۔

اس کے بعد اثم و بغی ہے۔ ان دونوں لفظوں کی تحقیق بھی پیچھے گزر چکی ہے۔ 'بغی' کے معنی تعدی اور سرکشی کے ہیں یعنی خدا کے حدود و احکام سے تعدی و سرکشی۔ اس کے ساتھ 'بِغَیْرِ الْحَقِّ' کی قید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی 'بغی' حق بھی ہوتی ہے بلکہ یہ 'بغی' کے گھنونے پن کو ظاہر کرتی ہے کہ ہر 'بغی' بجائے خود ناحق ہوتی ہے۔ یہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ خدا سے اکڑے اور اس کے حدود پر حملہ آور ہو۔ جس طرح قتل انبیا کے جرم کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی استعمال ہوا ہے۔

'وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا' یعنی جہاں تک خدا کو ماننے کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے اور مشرک بھی خدا کو مانتا ہے، رہی یہ بات کہ خدا کا کوئی شریک بھی ہے تو اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور دلیل بھی ایسی جو 'برہان' یعنی ایک حجت قاطع کی حیثیت رکھتی ہو اس لیے کہ خدا کی خدائی میں یوں ہی کسی کو جوڑ دینا سارے نظام عقل و فطرت اور پورے نظام عدل و قسط کو درہم برہم کر دینا ہے۔ اتنی بڑی بات بغیر اس کے مان لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ خدا نے اس کی کوئی نقلی یا عقلی یا فطری دلیل اتاری ہو۔

'وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ' 'قول علی اللّٰہ' سے مراد 'افتراء علی اللّٰہ' ہے یعنی اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہرانا، اپنی خواہشوں کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کرنا، من مانے طور پر شریعت تصنیف کرنا اور ان ساری چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا کہ خدا نے ان کا حکم دیا ہے۔ اس ٹکڑے سے نبوت و رسالت کی ضرورت کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ جب خدا کی طرف کوئی بات بے سند منسوب کرنا نا جائز ہے تو لازم ہے کہ اس کی طرف سے رسول آئیں اور ان کی پیروی کی جائے۔

فرد قرارداد جرم کے بعد انذار

'وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ الایۃ' ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں عرض کر چکے ہیں کہ اصلاً یہ سورہ انذار کی سورہ ہے۔ یہ باتیں جو اوپر بیان ہوئیں محض فرد جرم یا اتمام حجت کی نوعیت کی ہیں۔ اس وجہ سے کلام بار بار اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہے۔ اوپر آیت ۲۹ میں 'کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ' میں جس طرح آخرت کی یاد دہانی

کی اسی طرح یہ آیت قریش کو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو یاد دلا رہی ہے کہ تمھاری ان تمام شرارتوں کے باوجود اگر تمھاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ پکڑ ہوگی ہی نہیں، یہ سنت اللہ جس طرح تمام سرکش و باغی قوموں کے باب میں، جیسا کہ آیت ۴-۹ میں بیان ہوئی، پوری ہوئی تم پر بھی لازماً پوری ہوگی۔ یہ مہلت جو تمھیں ملی ہے اس وجہ سے ملی ہے کہ اللہ نے ہر امت کی تباہی کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ جب وہ پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہوگی نہ آگے بڑھے گی۔

افراد اور اقوام کے لیے اجل کے الگ الگ پیمانے

یہاں اس مقررہ مدت کے لیے 'اَجَل' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ افراد اور اقوام کے معاملے میں خدا نے 'اَجَل' کے پیمانے الگ الگ رکھے ہیں۔ افراد کے پیمانے تو سالوں، مہینوں، دنوں اور گھنٹوں منٹوں کے حساب سے پورے ہوتے ہیں، جب وہ پورے ہو جاتے ہیں، فرد ختم ہو جاتا ہے۔ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کا حساب ان کے ایمانی و اخلاقی زوال سے ہوتا ہے۔ اخلاقی زوال و فساد کی ایک خاص حد ہے جو کسی قوم کے پیمانہ کے بھر جانے کی نشانی ہے۔ جب قوم گرتے گرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے، اس کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ جس طرح افراد کی موت کا وقت اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم، اسی طرح قوموں اور ملتوں کے فنا ہونے کے صحیح وقت کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کب کوئی قوم اپنے زوال اخلاق کے اعتبار سے اس آخری حد پر پہنچ گئی کہ اب اس کا صفحۂ ارض پر باقی رہنا حکمت الٰہی کے خلاف ہے۔ یہاں وہ سنت الٰہی یاد رکھنی چاہیے جس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کر چکے ہیں کہ کسی قوم میں رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کی آخری شکل ہوتی ہے اس وجہ سے قوم جب اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو لازماً فنا کر دیتا ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ یونس کی تفسیر میں آئے گی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (۳۵-۳۷)

شیطان کے فتنوں سے امان رسول کی پیروی میں ہے

'يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ' یہ اس وعدے کی یاد دہانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے اس وقت فرمایا تھا جب آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا واقعہ پیش آیا ہے۔ سورہ بقرہ میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸-بقرہ (ہم نے کہا، یہاں سے اترو تم سب تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کوئی اندیشہ طاری ہوگا، نہ ان کو کسی بات کا غم ہوگا)

آدم اور اولادِ آدم سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ ان کو شیطان اور اس کی ذریات کی فتنہ انگیزیوں سے بچانے کے لیے فرمایا تھا کہ اگر شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہنا ہے تو میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرنا۔ آدم و ابلیس کی جو سرگزشت اس سورہ میں اوپر بیان ہوئی ہے اس پر غور کیجیے تو اس کے اندر اس انتظام کی عقلی و فطری ضرورت موجود ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریتِ آدم کے باب میں فرشتوں کے گمان کی تردید بھی اولادِ آدم میں پیدا ہونے والے انبیاء و مصلحین کے ناموں کے حوالہ ہی سے فرمائی تھی۔ یہی وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نسلِ آدم میں انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری کر کے پورا فرمایا۔ اسی کی یاددہانی یہاں قریش کو کی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں شیطان نے بالکل اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ اس کے فتنوں سے امان کی شکل وہی ہے جو شروع ہی میں بتا دی گئی تھی کہ جو رسولوں کی پیروی کریں گے وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہیں گے تو تم اگر شیطان کے فتنوں سے امان چاہتے ہو تو اس رسول کی پیروی کرو جو تمہیں اللہ کی آیات سناتا ہوا آگیا ہے۔

كفار كے انجام كا بيان

'وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ' استکبار کے بعد حرف 'عَنْ' اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ استکبار یہاں اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول آیاتِ الٰہی سناتے آئیں گے تو جو لوگ ان کو جھٹلائیں گے اور متکبرانہ ان سے منہ موڑیں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔

'فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ الاية' اوپر کی آیات میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یاددہانی ہے۔ اب یہ براہِ راست قریش کی نسبت ارشاد ہو رہا ہے کہ ان سے بڑھ کر ظالم اور بدقسمت کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھیں یا اس کی آیات کی تکذیب کریں 'اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ' اس دنیا میں زندگی کے جو دن نوشتۂ تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں وہ یہ پورے کریں گے یہاں تک کہ ہمارے فرشتے ان کو موت دیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے رہے ہو وہ کہاں گئے، اب ان کو پکارو۔ یہ اس 'اِفْتَرَاءً عَلَى اللّٰهِ' کی وضاحت ہو گئی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ شرک کو 'اِفْتَرَاءً عَلَى اللّٰهِ' کہنے کی وجہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں۔ فرشتوں کے لیے 'رُسُل' کا لفظ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات میں آیا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ 'رَسُوْل' اور 'مَلَك' کے لغوی مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہاں 'رُسُل' کا لفظ جمع لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ ملک الموت اور ان کے تمام عملہ پر حاوی ہے۔ 'قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا' یہ ان کے اعتراف کی تعبیر ہے اور وہ اپنے اس اعتراف سے اپنے کفر کی شہادت خود اپنی زبان سے دیں گے۔ کسی اور کی گواہی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ

لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ (۳۸-۴۰)

'قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ' یہ وہ انجام بیان ہو رہا ہے جو ان لوگوں کے سامنے آئے گا۔ 'قَالَ' کا فاعل جب اس طرح کے مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے تو یہ بے اعتنائی اور بے رخی پر دلیل ہوتا ہے۔

یہاں دو ظرف مذکور ہوئے ہیں 'فِيْۤ اُمَمٍ' اور 'فِي النَّارِ'۔ پہلے سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ تمہارے ساتھی کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا، جاؤ، ان لوگوں کے شریک حال بنو جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے شیطان کی پیروی کر کے گمراہ ہوئے، دوسرے سے مستقر و مقام کا پتا دیا ہے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہو گا۔ گویا ساتھی بھی بدترین، جگہ بھی بدترین!

'كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا' الایۃ۔ 'اِدَّارَكُوْا' اصل میں 'تدارکوا' ہے۔ عربی میں الفاظ کی ہیئت میں بعض اوقات اس طرح کی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ 'تدارك القوم' 'تلاحقوا ای لحق اُخْرٰىهُمْ اولٰىهُمْ' (تدارك القوم کے معنی ہیں قوم کے پچھلے اگلوں سے جا ملے) 'قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ' میں 'ل' 'فی' کے معنی میں ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ یعنی پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں کہیں گے۔

'ضِعْفٌ' کے معنی دوگنے کے بھی ہیں اور قرینہ موجود ہو تو اس سے زیادہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

اہل دوزخ کی باہمی جوتی پیزار کی تصویر

یہ تصویر ہے اس جوتی پیزار کی جو ان لوگوں کے اندر دوزخ کے باڑے میں اکٹھے ہو جانے کے بعد ہو گی۔ دنیا میں تو یہ ایک دوسرے کے تابع اور متبوع، لیڈر اور پیرو، ساتھی اور مددگار بنے رہے، ایک دوسرے کے گن گاتے اور جھنڈے اٹھائے پھرتے رہے، سلامیاں اور ایڈریس پیش کرتے رہے۔ لیکن وہاں دوزخ میں آمنے سامنے ہوتے ہی ہر گروہ دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائے گا۔ تابعین متبوعین سے کہیں گے تم پر پھٹکار ہو، تمہیں نے ہمارا بیڑا غرق کیا! متبوعین کہیں گے تم خود شامت زدہ تھے کہ تم ہماری راہ چلے اس میں ہمارا کیا قصور!

یہ صورت حال تو اس وقت کی بیان ہوئی ہے جب بالکل اول اول آمنے سامنے ہوں گے، اس کے بعد جب سب اکٹھے ہو لیں گے تو پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں خدا سے استغاثہ کریں گے کہ خداوندا ہم انہی کے ہاتھوں گمراہ ہوئے اس وجہ سے تو ان کو دونا عذاب دے۔ ارشاد ہو گا 'لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ' تم میں سے ہر ایک کے لیے یعنی اگلوں اور پچھلوں دونوں ہی کے لیے دونا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نیکی ہو یا بدی دونوں ہی اپنی فطرت کے اعتبار سے متعدی چیزیں ہیں۔ یہ اپنے

کرنے والوں ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہیں بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی منتقل ہوتے ہیں یہاں تک کہ وراثت در وراثت ہو کر نیکی کا ایک ذرہ احد پہاڑ کے برابر ہو سکتا ہے اور بدی کا ایک تخم فساد ایک لق و دق جنگل کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ یہی اصول اس حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں حضورؐ نے کوئی اچھی یا بری مثال قائم کرنے والوں کے نتائج اعمال کی وسعت و زیادت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں جو قتل بھی ہوتا ہے اس کے وبال کا ایک حصہ آدم کے بیٹے قابیل کے کھاتے میں جمع ہو رہا ہے جس نے ہابیل کو قتل کر کے قتل ناحق کی طرح ڈالی۔ یہاں زیر بحث ٹکڑے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تم میں سے اگلے اور پچھلے دونوں ہی کے لیے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ ان کے گناہوں میں سے بھی حصہ ملنے والا ہے جن کے لیے تم نے ان گناہوں کی مثال قائم کی۔ تم فریاد کر رہے ہو کہ تمھارے اگلوں نے تمھارے لیے بری مثال قائم کی اس وجہ سے ان کو زیادہ عذاب ہو۔ ان کو بے شک زیادہ عذاب ملے گا لیکن آخر تم نے جو بری مثال قائم کی یا اپنے بعد والوں کے لیے چھوڑی اس کے نتائج سے کس طرح بچ جاؤ گے؟ جو پیمانہ ان کے لیے ہے وہی پیمانہ تمھارے لیے ہے۔ اگر ان کی روش بد کے ساتھ ساتھ تم اپنی روش بد کے اثرات کا بھی علم اور اندازہ رکھتے تو تم جانتے کہ تم اور وہ دونوں یکساں مجرم ہو لیکن تمھیں اپنے بوئے ہوئے تخم فساد کی لہلہاتی فصل کی ہولناکیوں کا صحیح تخمینہ معلوم نہیں ہے۔ اب وہ تمھارے سامنے آئے گا۔

جیسے ہم ویسے تم

'وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ الایۃ' یہ اگلوں کی طرف سے پچھلوں کی مذکورہ بالا بات کا جواب ہوگا کہ اگر ہم نے تمھارے لیے بری مثال قائم کی تو تم نے دوسروں کے لیے کون سی اچھی مثال قائم کی۔ بات تو جب تھی کہ تم نے کوئی اچھی مثال قائم کی ہوتی۔ اس صورت میں بے شک تم ہمارے مقابل میں ترجیح اور فضیلت کے سزاوار تھے لیکن جب تم بھی وہی کچھ کر کے آئے ہو جو ہم کر کے آئے ہیں تو ہم میں اور تم میں فرق کیا؟ جس طرح ہم اپنے کیے کا مزا چکھیں گے تم بھی اپنے کیے کا مزا چکھو۔

'اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا الایۃ' لفظ 'استکبار' کے ساتھ 'عَنْ' کے صلہ کا فائدہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ ... الآیۃ کے دو مفہوم

'لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ' کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے لیے سما و جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، دوسرا یہ کہ اہل ایمان کی طرح آسمان میں ان کا خیر مقدم نہیں ہوگا بلکہ وہ نہایت ذلت و فضیحت کے ساتھ اپنا انجام بد دیکھنے کے لیے مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح ہنکاتے ہوئے لے جائے جائیں گے۔ قاعدہ ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام مقصود ہوتا ہے ان کے لیے نہایت اہتمام سے پھاٹک کھولے جاتے ہیں، پھاٹک پر ان کے خیر مقدم کے لیے ان کے خیر مقدم کرنے والے دو رویہ کھڑے ہوتے ہیں، وہ اہلاً و سہلاً، احسنت اور مرحبا' سلام اور تحیت کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کی تذلیل مدنظر ہوتی ہے وہ قیدیوں کی طرح جیل کے پھاٹک کی کھڑکی سے اس کے اندر ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ گویا 'لَا تُفَتَّحُ'

سے مقصود نفسِ فعل کی نفی نہیں بلکہ اس کے لازم کی نفی ہے جس کی مثالیں کلامِ عرب میں بہت ملتی ہیں۔

متکبر جنت میں نہیں داخل ہو سکتا

'لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ' یہ اس قسم کا اسلوب بیان ہے جس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان متکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے۔ تعبیر کا یہ اسلوب قدیم صحیفوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ انجیل میں ہے "اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" متی ۱۹: ۲۳-۲۴۔ قرآن اور انجیل کی تعبیر میں بس یہ فرق ہے کہ سیدنا مسیح نے سبب استکبار یعنی دولت کا حوالہ دیا ہے اور قرآن نے اصل جرم یعنی استکبار کا۔ اوپر ہم آدم و ابلیس کے قصے میں استکبار کی حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ابلیس کے جنت سے نکالے جانے کا اصل سبب استکبار ہوا اس وجہ سے جن کے اندر استکبار کا کوئی شائبہ ہوگا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھیں گے۔ سیدنا مسیح کا ارشاد ہے۔ "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے"۔

'لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ' مہاد کے معنی بچھونے کے ہیں اور غواش 'غاشیۃ' کی جمع ہے جس کے معنی ڈھانک لینے والی کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اوڑھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے اوپر اور نیچے سے جہنم ہی اوڑھنا بچھونا ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۲-۴۳)

اہلِ ایمان کا حال جنت میں

'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الاٰیۃ' اب یہ تقابل کے اصول پر اہلِ ایمان کا حال بیان ہو رہا ہے کہ وہ جنت میں کس طرح خوش و خرم، ایک دوسرے سے راضی و مطمئن اور اللہ کی توفیق ہدایت اور رسولوں کی رہنمائی پر کس طرح سراپا شکر و سپاس ہوں گے۔ آیت میں 'لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ' کا ٹکڑا بطور جملہ معترضہ ہے جس سے یہ اطمینان دلا دیا کہ یہ ذمہ داری اللہ نے اپنے بندوں پر ان کی حدِ وسع سے زیادہ نہیں ڈالی ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ایسا بوجھ ہے جو اٹھایا نہیں جا سکتا۔ یہ ذمہ داری بس اسی حد تک ہے جس حد تک بندوں کے امکان میں ہے۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

'وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ' اس ٹکڑے میں زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس کی ایک سے زیادہ مقامات میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ بسا اوقات ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے 'فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا' (پس آج ہم ان کو بھلا

دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا) ظاہر ہے کہ یہاں بھلا دینے سے اس کا لازم یعنی عدم التفات مراد ہے، ورنہ اللہ کے کسی چیز کو بھلا دینے کے کیا معنی ؟ وہ تو کوئی چیز بھی کبھی نہیں بھلاتا۔ اسی طرح فرمایا 'فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ' (پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا) میں تمھیں یاد رکھوں گا، یعنی میری نظرِ عنایت تم پر برابر رہے گی، ہر قدم پر تمھاری مدد کروں گا، اپنا ایک ایک وعدہ جو میں نے تم سے کیا ہے پورا کروں گا اور مزید برآں اپنے فضلِ ابدی سے نوازوں گا۔

اسی اسلوب پر یہاں 'نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ' سے مراد اس کا لازم ہے یعنی اہلِ ایمان جنت میں ایک دوسرے سے تپاک اور محبت سے ملیں گے، ایک دوسرے کا خیر مقدم کریں گے، آمنے سامنے بیٹھ کر آپس میں تبادلۂ مہر و محبت کریں گے، ان کے درمیان کسی رنجش و کدورت کا شائبہ نہ ہوگا۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں 'عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ' کے الفاظ سے ادا ہوا ہے۔ یعنی وہ آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے اس لیے کہ ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے۔ ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھنا باہمی رنجش کی دلیل ہے اور آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی۔ قرآن نے یہاں 'نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ' سے اہلِ جنت کی اسی حالت کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بات ٹھیک ٹھیک اہلِ دوزخ کی اس حالت کے مقابل میں بیان ہوئی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ وہاں تو آپس میں لعنتوں کا تبادلہ ہوگا، جوتیوں میں دال بٹے گی اور یہاں مجلس مہر و محبت کی عطر بیزیوں سے معمور ہوگی۔

منزل پر پہنچنے کے بعد اہل جنت کا جذبۂ شکر و سپاس

'وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا' یہ وہ شکر ہے جو کسی طویل اور پر صعوبت سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا ہے۔ 'هَدَانَا لِهَٰذَا' میں اللہ تعالیٰ کی اس توفیق بخشی کی طرف بھی اشارہ ہے جو طالبینِ حق کو ہر قدم پر حاصل ہوتی ہے اور اس رہنمائی کی طرف بھی جو اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مہیا فرماتا ہے۔ 'وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ' میں اس سفر کے پر صعوبت ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس بات کی طرف بھی کہ اہلِ جنت کو جو کامیابی حاصل ہوگی وہ ان کی توقعات اور امیدوں، ان کے قیاسات اور اندازوں سے اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ اس کو خدا کا فضل ہی فضل سمجھیں گے، اس میں اپنی سعی و تدبیر کے کسی دخل کا ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔

'لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' اللہ تعالیٰ کے شکر کے بعد یہ انبیا و رسل کی عظیم خدمات اور ان کی کہی ہوئی ہر بات کی صداقت کا اعتراف ہے۔ یعنی اہلِ جنت رسولوں کی دی ہوئی ہر خبر کو واقعہ کی شکل میں دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ انھوں نے جو کچھ کہا حرف حرف حقیقت ثابت ہوا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جن کی تکذیب اور جن کے استکبار کا اوپر ذکر ہوا۔

تکمیلِ نعمت کی معراج

'وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ جنت کے لیے منادی عام ہوگی کہ اس جنت کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے۔ اہلِ جنت کا خود اپنا احساس

تو اوپر یہ نقل ہوا ہے کہ وہ اس جنت کو اپنی سعی و عمل کے بجائے صرف خدا کے فضل و احسان کا ثمرہ سمجھیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو ان کے سعی و عمل کا ثمرہ قرار دے گا۔ یہ تکمیل نعمت کی معراج ہے۔ بندوں کے اعمال کا درجہ اس آیت نے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ اونچے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہم جو کچھ پاتے ہیں خدا کے فضل ہی سے پاتے ہیں۔ آخرت میں بھی خدا کے فضل ہی سے پائیں گے لیکن رب کریم اس کو ہمارا حق اور ہماری محنت کا ثمرہ قرار دے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس ابدی بادشاہی کا جس کے متعلق ہر شخص کا شعور یہ ہو گا کہ یہ اس نے اپنی کوششوں سے بنائی ہے اور یہ لازوال ہے! انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کو نعمتیں حاصل ہوں بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اس کی اپنی ہوں۔ اس احساس کے بغیر وہ کسی نعمت کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی فطرت کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے گا۔

ایک لطیف تلمیح اس آیت میں وراثت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایک لطیف تلمیح ہے اس ماجرے کی طرف جو اوپر آدمؑ کے جنت سے نکلے جانے کا مذکور ہوا ہے۔ وہاں یہ ارشاد موجود ہے کہ اولادِ آدمؑ میں سے وہی لوگ اپنے باپ کی اس جنت کے وارث ٹھہریں گے جو شیطان کی تمام فتنہ آرائیوں کے علی الرغم ایمان و عمل صالح کی صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے۔ یہاں اُورِثْتُمُوْهَا کا لفظ استعمال کر کے گویا شاباش دے دی کہ بے شک تم نے بازی جیت لی اور اب تم حقدار ہو کہ تم اس جنت کے وارث بنائے جاؤ۔

۶۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۴-۵۳

آگے وہ سوال و جواب مذکور ہوا ہے جس کا تبادلہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان ہو گا۔ اہلِ جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ ہم سے تو ہمارے رب نے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے سب پورے ہوئے، تم بتاؤ، تم نے بھی وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا یا نہیں جس کی تمھیں خبر دی گئی تھی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں، سب دیکھ لیا۔ اس کے بعد ایک منادی ان پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا۔

پھر یہ بیان ہوا کہ اعراف کی بُرجیوں سے رجالِ امت کے ایک گروہ کو جنت و دوزخ کے احوال کا مشاہدہ کرایا جائے گا کہ وہ دیکھ لیں کہ اللہ کے جن وعدوں کے لیے وہ جیے اور مرے وہ کس طرح پورے ہوئے۔ یہ اصحاب الاعراف اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کو ان کی علاماتِ امتیاز سے پہچانتے ہوں گے وہ اہلِ جنت کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دیں گے اور اہلِ دوزخ کے قائدین کو پھٹکاریں گے کہ بتاؤ تمھاری ساری جمعیت اور تمھارا سارا غرہ کیا کام آیا، تم قسمیں کھا کھا کے جن کے باب میں یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے، وہ کہاں ہیں اور تم کہاں بھاڑ جھونک رہے ہو؟

اس کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ اہلِ دوزخ پانی کے لیے ترلے کر رہے ہوں گے اور اہلِ جنت

سے فریاد کریں گے کہ کچھ ادھر بھی نظرِ کرم کرو لیکن وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ دوزخ کے لیے ان چیزوں کی مناہی کر رکھی ہے۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ جنت و دوزخ کا جو احوال سنایا جا رہا ہے، یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کو آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب اتاری جس میں اپنے علمِ قطعی کی روشنی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی تفصیل سنا دی ہے تاکہ جو ایمان لانا چاہیں وہ اس ہدایت کو اختیار کر کے اپنے آپ کو رحمت کا سزاوار بنا لیں لیکن یہ اپنی رعونت کے سبب سے منتظر ہیں کہ جب یہ ساری باتیں واقعات کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گی تب ان کو مانیں گے لیکن وہ وقت ماننے کا نہیں ہوگا بلکہ سر پیٹنے کا ہوگا ـــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَنَادَىٰٓ أَصْحَـٰبُ ٱلْجَنَّةِ أَصْحَـٰبَ ٱلنَّارِ أَن قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا آیات
رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدتُّم مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوا۟ نَعَمْ ۚ ۴۴-۵۳
فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ أَن لَّعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿۴۴﴾ ٱلَّذِينَ
يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَهُم بِٱلْـَٔاخِرَةِ
كَـٰفِرُونَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى ٱلْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ وقف لازم
كُلًّۢا بِسِيمَىٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا۟ أَصْحَـٰبَ ٱلْجَنَّةِ أَن سَلَـٰمٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ
يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿۴۶﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَـٰرُهُمْ تِلْقَآءَ
أَصْحَـٰبِ ٱلنَّارِ قَالُوا۟ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ ٱلْقَوْمِ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿۴۷﴾ ع ۵ ۸ ۱۲
وَنَادَىٰٓ أَصْحَـٰبُ ٱلْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُم بِسِيمَىٰهُمْ قَالُوا۟
مَآ أَغْنَىٰ عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۴۸﴾ أَهَـٰٓؤُلَآءِ ٱلَّذِينَ
أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ ٱللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ٱدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ
عَلَيْكُمْ وَلَآ أَنتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۴۹﴾ وَنَادَىٰٓ أَصْحَـٰبُ ٱلنَّارِ أَصْحَـٰبَ
ٱلْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا۟ عَلَيْنَا مِنَ ٱلْمَآءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ ۚ قَالُوٓا۟

إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ
لَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ
يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ
بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ
مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ
شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ
قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۲﴾ ع ۶ / ۱۴

ترجمہ آیات ۴۴-۵۳

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم سے تو جو کچھ ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو بالکل سچا پایا، کیا تم نے بھی جو کچھ تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا اس کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے، ہاں! پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر — ان پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ۴۴-۴۵

اور ان کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہلِ جنت کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر اللہ کی رحمت و سلامتی ہو — وہ اس میں ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن متوقع ہوں گے۔ اور جب ان کو اہلِ دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی، وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان ظالموں کا ساتھی نہ بنائیو! اور برجیوں والے

کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے آواز دیں گے۔ کہیں گے، کیا کام آئی تمھارے تمھاری جمعیت اور تمھارا وہ سارا گھمنڈ جو تم کرتے تھے! کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے! داخل ہو جنت میں، اب نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تمھیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۴۶-۴۹

اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے، جو اللہ نے تمھیں بخش رکھی ہیں، کچھ ہم پر بھی کرم فرماؤ۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لیے حرام کر رکھی ہیں ـــ ان کے لیے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا اور جن کو دُنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا، پس آج ہم ان کو نظر انداز کریں گے جس طرح اُنھوں نے اپنے اس دن کی مُلاقات کو بُھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے ـــ اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علمِ قطعی کی بنیاد پر کی ہے، ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ یہ لوگ بس اس کی حقیقت کے مشاہدے کے منتظر ہیں۔ جس روز اس کی حقیقت سامنے آئے گی، وہ لوگ جنھوں نے اس کو پہلے نظر انداز کیے رکھا، بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے، تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں!! انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گئے!۔ ۵۰-۵۲

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۴۴)

جنت میں انسانی قوتوں کا عروج

یہ آیت ایک نہایت ہلکا سا تصور دیتی ہے اس انقلابِ حال کا جو جنت میں پہنچ کر انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے اندر برپا ہوگا۔ اس دنیا میں تو ہمارے سمع و بصر اور ادراک و ابلاغ کی قوتیں نہایت محدود ہیں۔ معمولی معمولی چیزیں ہماری ان قوتوں کی راہ میں روک بنی ہوئی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ جنت کے عالم سے جب چاہیں گے اہلِ جنت دوزخ والوں کو مخاطب کر کے ان سے سوال و جواب کر لیں گے۔

اس سائنسی دور کے انسان کے لیے یہ بات ذرا بھی حیران کرنے والی نہیں ہونی چاہیے۔ جب آج انسان نے قدرت کے محض چند ضمنی قوانین کا راز دریافت کر کے اپنے لیے ایسی دوربینیں ایجاد کر لی ہیں جن کی مدد سے ہزاروں میل کی مسافت پر جلنے والی شمع کی لَو کو دیکھ سکتا ہے، ایسے فون بنا لیے ہیں جن کی وساطت سے جب چاہے پاکستان کا پریسیڈنٹ امریکہ کے پریسیڈنٹ سے بات کر سکتا ہے، ایسے ٹیلی ویژن بنا لیے ہیں جن پر ایک ملک کے لوگ کسی دور دراز ملک کے کسی خطیب کو اپنے ملک کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتے، مجمع کو تالیاں پیٹتے اور نعرے لگاتے دیکھ اور سن سکتے ہیں، ایسے آلات بنا لیے ہیں جو اس کو لاکھوں میل کی مسافت سے نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن سے آگاہ کر سکتے ہیں تو آخر اس عالم کی باتوں پر حیران ہونے کی کیا وجہ ہے جہاں یہ سارے نوامیس طبیعی، جو آج ہمیں جکڑے ہوئے ہیں، بدل جائیں گے اور اس زمین و آسمان کی جگہ نئے آسمان و زمین پیدا ہو جائیں گے۔

اہلِ دوزخ کی تفضیح

اہلِ جنت کا یہ سوال اہلِ دوزخ سے جو یہاں نقل ہوا ہے، تبلیغ و تذکیر کے مقصد سے تو ظاہر ہے کہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ اس کا وقت تو گزر چکا ہوگا، اس کا مقصد محض اہلِ دوزخ کی تفضیح ہوگا۔ اس کے جواب میں اہلِ دوزخ کا اعتراف گویا مجرم کا وہ آخری اعتراف ہوگا جس کے بعد اس کے اور اس کی سزا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ ایک منادی ان ظالموں پر اللہ کی لعنت کا اعلان کرے گا اور یہ اعلان ہم معنی ہوگا اس کے کہ اب سزا اور عذاب کا باب شروع ہو گیا۔

ایک لطیف تضمین

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ (۴۵)۔ عام طور پر لوگوں نے اس ٹکڑے کو منادی کے اعلان ہی کا ایک حصہ سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک منادی کا اعلان لفظ ظٰلِمِيْنَ ہی پر تمام ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ٹکڑا بطور تضمین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کے طور پر اس کے ساتھ

لگایا ہے تاکہ کلام محض مستقبل کی ایک حکایت بن کے نہ رہ جائے بلکہ حال پر بھی پوری طرح منطبق ہو جائے۔ اس تضمین سے گویا یہ وضاحت ہو گئی کہ ظالمین سے مراد کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا کہ وہی لوگ جو آج اللہ کی راہ سے لوگوں کو روک رہے ہیں، جو اس میں کجی پیدا کرنے کے لیے ساعی ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔ اس وضاحت کے بعد آخرت میں ہونے والی منادی وقت کے قریش پر ٹھیک ٹھیک اس طرح چسپاں ہو گئی، گویا

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

اس قسم کی تضمینات قرآن مجید میں بہت ہیں۔ پیچھے بھی اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، آگے بھی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ اس کی ایک مثال آیت ۵۱ میں بھی آ رہی ہے۔ انہی تضمینات سے بالعموم اصولی باتیں یا مستقبل کے ماجرے یا ماضی کی سرگزشتیں حاضر اور حال کا جامہ پہنتی ہیں۔ اس وجہ سے ان پر خاص طور پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے ورنہ نظم کلام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تاویل میں ایسے تکلف سے کام لینا پڑتا ہے جس سے نہ صرف ذوق ابا کرتا ہے بلکہ زبان کے آداب و قواعد بھی اس کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں بھی جن لوگوں نے اس کو تضمین نہیں مانا انھیں 'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ' کے ٹکڑے کی تاویل میں تکلف کرنا پڑا۔ انھوں نے اس کو 'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ' کے معنی میں لیا حالانکہ یہ قرآن میں ایک قسم کا اضافہ ہے۔

'اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ' میں 'صد' کا لفظ لازم اور متعدی یعنی رکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ ایسے الفاظ کے ترجمے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میرے نزدیک ایسے الفاظ کے باب میں محتاط طریقہ یہ ہے کہ اگر قرینہ واضح ہو تب تو قرینہ کے تقاضے کے متعلق ترجمہ کرنا چاہیے ورنہ متعدی مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ اولیٰ ہے اس لیے کہ متعدی کے اندر لازم کا مفہوم خود مضمر ہوتا ہے۔

'اَلَّذِيْنَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' میں عوج سے مراد تو اگرچہ وہ ساری کج رائیاں اور کج عملیاں ہو سکتی ہیں جو خدا کی راہ سے ہٹ کر انسان اختیار کرتا ہے لیکن نظائر قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مفہوم خدا کی صراط مستقیم یعنی توحید کی راہ میں کجی پیدا کر کے شرک کی پگڈنڈیاں نکالنا ہے۔ ان نظائر کی وضاحت کسی مناسب محل میں ان شاء اللہ تفصیل سے آئے گی۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا
مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ
وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ
عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۶-۴۹)

'حجاب' سے مراد جنت اور دوزخ کے درمیان کی دیوار ہے

'وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا ۢ بِسِيْمٰىهُمْ'۔ 'حجاب' سے مراد جیسا کہ خود قرآن کے دوسرے مقام سے واضح ہے، وہ دیوار ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان کھڑی کر دی جائے گی۔ سورہ حدید

میں ہے۔ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ ۱۳۔ حدید (پس ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی) ایک ایسی دیوار کے طول و عرض کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو پورے عالمِ جنت اور سارے عالمِ دوزخ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دے گا جب کہ صرف جنت کی وسعتوں کی تمثیل قرآن نے آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے دی ہے۔

'اعراف' کا مفہوم

'اَعْرَاف'، 'عُرْف' کی جمع ہے۔ 'عرف' گھوڑے کی پیشانی کی چوٹی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کسی مینارہ یا بُرجی یا دیدبان کے لیے استعمال ہوا جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پر بنا دیا جائے، جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا بیک نظر مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوبِ بیان سے واضح ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی کی جائے گی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اسی دیوار پر ہوں گے جہاں سے جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ ہو سکے گا۔

'رجال' سے مراد

'رِجَال' کا لفظ یوں تو اپنے عام مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے بالعموم نمایاں اور ممتاز اشخاص مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۳۷۔ نور (ایسے رجال جن کو تجارت اور خرید و فروخت یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی) مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۲۳۔ احزاب (اور اہلِ ایمان میں ایسے رجال ہیں جنھوں نے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو خدا سے انھوں نے باندھا) یہیں آیت ۴۸ میں بھی یہ لفظ ائمۂ کفر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ (اور اعراف والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے پکاریں گے، کہیں گے بتاؤ کیا کام آئی تمھاری جمعیت اور کیا کام آیا تمھارا گھمنڈ)

'کُلًّا'۔ لفظ 'کل' ہم دوسرے مقام میں بتا چکے ہیں کہ جب یہ جماعتوں یا اشخاص کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے معرفہ بن جاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد وہی گروہ یا اشخاص ہوں گے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ یہاں اوپر اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کا ذکر ہوا ہے چنانچہ اس سے مراد وہی دونوں گروہ بحیثیت گروہ ہیں۔

اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ اپنی علامتوں سے ممتاز ہوں گے

'سِیْمَا' کے معنی علامت اور نشان کے ہیں مثلاً سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ قرآن مجید اور احادیث دونوں میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ قیامت میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں اپنے اپنے اعمال کے اثرات سے ممتاز و ممیز ہوں گے۔ مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کی امت میں سے جو لوگ آپ کے بعد آئیں گے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا، اگر ایک شخص کے پنچ کلیان گھوڑے دوسرے گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ ان کو پہچان نہ لے گا؟ لوگوں نے کہا، یہ بات تو ٹھیک ہے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا اسی طرح میری امت کے لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے آثار سے اس طرح نمایاں ہوں گے کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ

پاؤں چمکتے ہوں گے۔ ابولہب کی بیوی کے متعلق خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں اس طرح کی رسی پڑی ہوئی ہو گی جس طرح کی رسی ایندھن جمع کرنے والی لونڈیاں اپنے گلے میں ڈال کر لکڑیاں چننے کے لیے نکلا کرتی ہیں۔ اس نوع کے بعض اشارات معراج سے متعلق احادیث میں بھی موجود ہیں۔ غرض یہ بات واضح ہے کہ اہل ایمان ہوں یا اہل کفر دونوں گروہ اپنے اپنے محل میں اپنی نمایاں نشانیوں اور علامات کے ذریعے سے ممتاز ہوں گے اور اہل اعراف ان علامات کے واسطہ سے اہل جنت کے صدیقین، شہدا اور صالحین و ابرار کو بھی پہچان لیں گے اور اہل دوزخ کے لیڈروں اور اشرار و مفسدین کو بھی۔

اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے

اجزائے کلام کی تشریح کے بعد قابلِ غور سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اصحاب الاعراف کون لوگ ہوں گے؟ ابن جریرؒ نے اس سوال کے جواب میں چار قول نقل کیے ہیں۔

ایک یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں تول میں برابر برابر اتری ہوں گی، اس وجہ سے ان کا فیصلہ ابھی معلق ہو گا کہ دوزخ میں بھیجے جائیں یا جنت میں۔

دوسرا یہ کہ یہ علما اور فقہا کا گروہ ہو گا۔

تیسرا یہ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں حصہ لیا ہو گا۔

چوتھا یہ کہ یہ ملائکہ ہوں گے۔

ان میں سے موخر الذکر دونوں قول تو بالکل ہی بے جان ہیں۔ ان کی تائید میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن میں موجود نہیں ہے اس وجہ سے ان پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا قول اگرچہ بہت مشہور ہے یہاں تک کہ مصرعؔ "از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است" ہمارے لٹریچر میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل کر گیا ہے لیکن کئی پہلوؤں سے یہ قول بھی ضعیف معلوم ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ یہاں ان کے لیے 'رجال' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جب اس طرح آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے مراد نمایاں اشخاص و رجال ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی نیکیاں اتنی بھی نہ ہوں گی کہ ان کی بدیوں پر بھاری ہو سکیں آخر ان کا ایسا نمایاں وصف کیا ہے جس کے سبب سے ان کا ذکر اس لفظ سے کیا گیا؟

دوسرا یہ کہ جن کی نیکیاں اور بدیاں دونوں برابر برابر ہوں گی ضروری نہیں کہ وہ سب مرد ہی ہوں، ان میں عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ان کے لیے رجال کا لفظ کیوں استعمال ہوا، کوئی ایسا لفظ کیوں نہ استعمال ہوا جو جامع نوعیت کا ہوتا مثلاً طائفہ یا امت یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ؟

تیسرا یہ کہ یہاں کسی ایک لفظ سے بھی نہ تو یہ بات نکلتی کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ماجرا بیان ہو رہا ہے جس کا معاملہ ابھی معلق ہے اور نہ یہ بات نکلتی کہ ان کو اعراف کی یہ سیر کرانے سے مقصود کیا ہے حالانکہ موقع ایسا ہے کہ یہ بات واضح ہونی چاہیے تھی۔

چوتھا یہ کہ یہ لوگ اہل جنت اور اہل دوزخ کو جس انداز میں مخاطب کریں گے، ان کو مخاطب کر کے جو جو باتیں فرمائیں گے اور ان کے ساتھ جس اعزاز و اکرام کا معاملہ مذکور ہوا ہے وہ سب اس امر کے خلاف ہے کہ یہ ایک ایسے گروہ کا ذکر ہو جس کی اپنی نجات کا معاملہ ابھی معلق اور جس کی اپنی کارگزاری کی نوعیت یہ ہو کہ نیکی اور بدی دونوں برابر برابر ہو کر رہ گئی ہوں۔ قرآن کے بیان سے واضح ہے کہ یہ لوگ اہل جنت کو مبارکباد دیں گے، اہل دوزخ کے لیڈروں کو سرزنش اور ملامت کریں گے کہ تم دنیا میں بہت اتراتے اور اکڑتے رہے ہو، بتاؤ تمھاری جمعیت اور تمھارا سارا سرمایۂ غرور کہاں گیا؟ ان کو لتاڑیں گے کہ تم خدا کی ساری نعمتوں کا اجارہ دار تنہا اپنے آپ کو سمجھتے تھے، غریب مسلمانوں کو کسی فضل کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے اب دیکھو تم کہاں ہو اور وہ کہاں ہیں؟ آخر میں اہل جنت کو تمکن اور دوام و استمرار کی بشارت دیں گے ——— غور کیجیے کہ یہ ساری باتیں ایسے لوگوں کی زبان سے کس طرح نکل سکتی ہیں جنھیں خود اپنی نجات کی فکر پڑی ہو کہ معلوم نہیں مشیت غیب کیا فیصلہ کرتی ہے؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ یہ ممکن ہے کہ اس طرح کی باتیں کسی مذبذب و متردد گروہ کے منہ سے نکل سکیں اور نہ اخلاقی پہلو سے یہ ایسے لوگوں کی زبان سے زیب ہی دیتی ہیں جن کے اپنے کارنامے کچھ زیادہ وقیع نہ ہوں۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ قول اپنی شہرت کے باوجود کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ صحیح قول ہمارے نزدیک دوسرا ہے۔ ابن جریر نے یہ قول مجاہدؒ کی طرف منسوب کیا ہے جن کا مرتبہ تفسیر میں معلوم و معروف ہے۔ مجاہدؒ نے علماء اور صلحاء سے مراد ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو لیا ہے جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں حق کے علم بردار، خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے رہے ہیں۔ جنھوں نے حق کی حمایت میں اہل باطل کے جور کے سہے ہیں اور جو مظلوموں کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے۔ ایسے علماء و فقہاء یا بالفاظ دیگر رجال امت بلاشبہ قیامت کے دن اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنت اور دوزخ دونوں کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا آخری انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اپنی زبانوں سے رفقائے حق کو مبارک باد دیں اور دشمنان حق کو سرزنش کریں۔

وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ یہ لوگ اعراف کی بلندیوں سے سب سے پہلے اہل جنت کو سلامتی و مبارکی کا پیغام دیں گے۔ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کو جنت میں بھیجنے سے پہلے ہی یہ مشاہدہ کرایا جائے گا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کی سچائی ہر پہلو سے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جنت میں داخل ہوں۔ وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ کے الفاظ سے ان کی تواضع جھلکتی ہے۔ باوجودیکہ یہ سارا اعزاز و اکرام صاف شہادت دے رہا ہوگا کہ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے لیکن وہ اپنی تواضع و فروتنی کے سبب سے اپنے آپ کو امیدوار رحمت ہی کے درجے میں سمجھیں گے چنانچہ یہاں الفاظ ٹھیک ٹھیک ان کی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ

ملحوظ رہے کہ جو لوگ اللہ کی شانیں جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو امید اور طمع کے درجے سے اونچا کبھی نہیں لے جاتے، یہ تنگ ظرفوں کا شیوہ ہے کہ وہ بہت تھوڑے میں بہک جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر فرماتے ہیں وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۸۲۔ شعراء (اور وہ کہ جس سے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ جزاو سزا کے دن میری غلطی معاف فرمائے گا) ہمارے حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا، کوئی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا، لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ آپ بھی؟ ارشاد ہوا ہاں میں بھی، 'اِلَّآ اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ' میں بھی اسی وقت جنت میں جاؤں گا جب اللہ کی رحمت مجھے ڈھانک لے۔

'وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُھُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ الاٰیۃ' یہ اسلوب بیان اکرام واعزاز پر دلیل ہے۔ پہلے وہ اہل جنت کی کامرانیوں کا مشاہدہ کریں گے اور اس کے مشاہدے میں بالکل محو ہو جائیں گے اس لیے کہ وہاں حال یہ ہوگا کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ من نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پھر اہل دوزخ کی طرف ان کو توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر دشمنان حق کے انجام پر بھی ڈال لیجیے۔ ان پر نظر پڑتے ہی اُن کی زبان سے بے تحاشا تعوذ کی دعا نکلے گی 'رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ' (اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کیجیو) جس طرح اوپر 'وَھُمْ یَطْمَعُوْنَ' کے الفاظ سے ان کی تواضع وفروتنی پر عکس پڑتا ہے اسی طرح یہ دعا ان کے کمال خشیت کی بھی دلیل ہے اور جہنم کے منظر کی ہولناکی کی بھی۔

اصحاب الاعراف کا خطاب کفار کے لیڈروں سے

'وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَھُمْ بِسِیْمٰھُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰی عَنْکُمْ جَمْعُکُمْ وَمَا کُنْتُمْ تَسْتَکْبِرُوْنَ'
اصحاب اعراف کا یہ خطاب الفاظ سے واضح ہے کہ اہل دوزخ کے لیڈروں سے ہوگا اس لیے کہ اپنی جمعیت پر ناز اور اپنے مال وجاہ پر غرہ انہی کو تھا۔ دوزخ میں یہ لوگ اپنے نمایاں نشان سے ممتاز ہوں گے اس وجہ سے اہل اعراف پہچان جائیں گے کہ یہ ابولہب ہے، یہ ابوجہل، یہ فلاں اور یہ فلاں۔ ان کو مخاطب کر کے اہل اعراف ان سے یہ سوال بطور تفضیح کریں گے۔ ہر دور کے ائمۂ کفر کا اپنے مال واسباب اور اپنی تعداد وجمعیت پر غرہ قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے۔ ہم نے یہاں 'مَا' کو سوالیہ مفہوم میں لیا ہے۔ اس میں زور بھی زیادہ ہے اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پھر بعد کا جملہ، جو اس سے متعلق ہے، واضح طور پر سوالیہ ہے بھی۔ اگر اس کو بعد والے جملہ سے الگ مفہوم میں لیں گے تو کلام میں ہم آہنگی باقی نہیں رہے گی۔

'اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُھُمُ اللّٰہُ بِرَحْمَۃٍ' یہ سوال ان ائمۂ کفر سے، اہل اعراف ساکنین جنت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کریں گے کہ بتاؤ کیا یہی وہ لوگ نہیں ہیں جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کے کہتے تھے کہ یہ کبھی خدا کے کسی فضل کے سزاوار نہیں ہو سکتے؟ قرآن میں مذکور ہے کہ سادات قریش اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل یہی لاتے تھے کہ اگر اس میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا تو کیا اس کے پیرو یہی فقیر، فاقہ کش اور غلام و نادار بنتے؟ خدا کی ساری نعمتوں کے سزاوار تو ہم بنائے گئے، پھر اس کے لیے ان کا انتخاب کیوں ہوا؟ اہلِ اعراف ان کے اسی غرور کو سامنے رکھ کر سوال کریں گے کہ فرماؤ، جن کو تم کسی فضل ورحمت کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے وہ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو؟

'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ'۔ اوپر والا سوال تو اہل اعراف ائمہ کفر کو مخاطب کر کے کریں گے اور یہ بات وہ اہلِ جنت کو مخاطب کر کے ان سے بطور تہنیت و تبریک کہیں گے جس سے برسرِ موقع ان کی توہین کرنے والوں کی تفضیح بھی ہو جائے گی۔

فعل تمکن و استمرار کے مفہوم میں

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اہلِ جنت تو بالفعل جنت میں براجمان ہوں گے ہی پھر ان کو مخاطب کر کے 'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ' (جنت میں داخل ہو) کہنے کے کیا معنی؟ غالباً اسی سوال سے بچنے کے لیے ارباب تاویل نے اس جملہ کے مخاطب اور اس کے قائل کے تعین میں بڑے تکلف سے کام لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سارا تکلف انھیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ انھوں نے عربیت کے اس اسلوب کو ملحوظ نہیں رکھا کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنی ہی پر دلیل نہیں ہوا کرتا، بعض مواقع میں وہ تمکن و استمرار پر دلیل ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھیے یہی 'اُدْخُلُوا' سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے جو اپنے ابتدائی مفہوم میں نہیں بلکہ تبریک و تہنیت اور تمکن و استمرار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۹۹- یوسف)

پس جب وہ یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو ان شاء اللہ امن کے ساتھ۔

یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت یوسفؑ کے سارے بھائی، ان کی ہدایت کے بموجب، اپنے والدین کو ساتھ لے کر، حضرت یوسفؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور حضرت یوسفؑ نے اپنے دربار میں ان کی پذیرائی فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے مصر میں داخل ہونے کا سوال نہیں تھا۔ وہ مصر میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے بلکہ ان کے والدین حضرت یوسفؑ کے پہلو میں فروکش اور یہ تمام بھائی حضرت یوسفؑ کے دربار میں موجود تھے۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کا یہ فرمانا کہ 'اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ' صریحاً تبریک و تہنیت اور بشارتِ تمکن کے مفہوم ہی میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک اسی مفہوم میں اصحاب اعراف کا اہلِ جنت کو مخاطب کر کے 'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ' فرمانا بھی ہے۔ یعنی مال و جاہ کے غرور کے متوالے تو تمھیں نہایت حقیر و ذلیل سمجھتے رہے ہیں لیکن اللہ نے ان کے علی الرغم تمھیں جنت کی سرفرازی بخشی۔

تم اس میں سرفراز رہو، اب نہ تمھارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵۰)

لفظ تحریم کا ایک خاص مفہوم

'حَرَّمَهُمَا' میں جس تحریم کا ذکر ہے یہ شرعی حرمت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس معنی میں ہے جس معنی میں 'فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۲۶-مائدہ ۵' (پس یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام کردی گئی) میں ہے۔ یعنی چالیس سال کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو حتمی طور پر اس سرزمین سے محروم کردیا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو کسی چیز سے حتمی طور پر محروم کردے تو نہ وہ چیز کسی طرح اس کو پہنچ سکتی اور نہ وہ اس کو کسی طرح پا سکتا۔ اہلِ جنت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سوال کے پورے کرنے میں تو کوئی عذر نہ نہیں ہے، ان کے پاس ہر نعمت کی فراوانی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے اہلِ دوزخ کو محروم کردیا ہے اس وجہ سے نہ یہ ان کو پہنچ سکتی ہیں نہ وہ ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۵۱)

ایک برمحل تضمین

یہ آیت بطور تضمین ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے جواب 'حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ' کی وضاحت اپنی طرف سے فرما دی کہ 'کافرین' سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس تضمین سے کلام بالکل مطابق حال ہوگیا، گویا قریش پر یہ بات واضح کردی گئی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صرف دوسروں کی حکایت ہے بلکہ یہ ان کی بھی حکایت ہے۔ اس قسم کی تضمین کی مثال اوپر آیت ۴۵ میں بھی گزر چکی ہے۔

'الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا' یعنی اللہ نے جو چیز ان پر دین کی حیثیت سے اتاری اس کو انھوں نے ہنسی مسخری میں اڑایا۔ ہر چیز کا ایک محل و مقام ہوتا ہے۔ دین اس لیے آتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطۂ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے بجائے فلاح و سعادت کی راہ اختیار کریں۔ لیکن جن لوگوں نے زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ایسے اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ خواہشات کے خلاف سنجیدہ سے سنجیدہ حقیقت کو بھی مذاق تصور کرتے اور مذاق ہی میں اس کو اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی!!

منکرینِ آخرت کا اصل دھوکا

'غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا' یہ اس لاابالیانہ طرزِ عمل کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ وہ کیوں زندگی کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے اندھے بنے رہے۔ فرمایا کہ دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں، دندنا رہے ہیں اور کوئی باز پرس ان سے نہیں ہو رہی ہے اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ بس دنیا اسی لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر کسی اللہ کے بندے نے ان کو توجہ دلائی کہ اس کے بعد ایک روزِ حساب کتاب بھی آنے والا ہے تو اس کے لتے لے ڈالے کہ یہ دیوانہ اور خبطی ہے۔ ہماری آزادی اور ہمارے عیش کو مکدر کر رہا ہے۔

'فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ' یہاں 'نَنْسٰهُمْ' نظر انداز کر دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ فعل کا استعمال اس اسلوب پر ہے جس کو دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ استعمال بظاہر فعل ہوتا ہے لیکن مقصود اس سے اس کا لازم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھولتا نہیں۔ یہ بھولنا نظر انداز کرنے کی تعبیر ہے۔

'لِقَآءَ' قرآن کے نظائر سے واضح ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوا ہے، کہیں اپنے ظرف کی طرف لیکن مدعا دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ یعنی رب سے ملاقات آخرت میں۔ انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا، یعنی اُس دن میں اپنے رب کی ملاقات کو بھلائے رکھا۔

'وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ' یہ جملہ چونکہ اوپر والے جملے ہی پر عطف ہے اس وجہ سے یہ دراصل 'كَمَا كَانُوْا' کے مفہوم میں ہے۔ 'کما' کے اندر تشبیہ و تمثیل کے ساتھ ساتھ سببیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ 'اور بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے' تو یہ ترجمہ بالکل صحیح ہوگا۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۵۲-۵۳)

کتاب الٰہی کی شکل میں قریش پر عظیم احسان

'وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ' 'هُمْ' کا مرجع قریش ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار فرمایا ہے جو قرآن کی صورت میں ان پر فرمایا۔ اس کتاب کی صفت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں ہم نے اپنے علمِ قطعی کی روشنی میں ان تمام امور کی تفصیل بیان کر دی ہے جن سے آگاہ ہونا دنیا و آخرت کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ان تفصیلات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اوپر اہل جنت، اہل دوزخ اور اصحاب الاعراف سے متعلق بیان ہوئی ہیں۔ جو ہیں اگرچہ عالمِ آخرت سے متعلق لیکن کوئی ان کو محض ہوائی اور خیالی باتیں (FICTION) نہ سمجھے بلکہ یہ پیش آنے والے حقائق ہیں جو تمام تر 'عَلٰى عِلْمٍ' بیان ہوئے ہیں۔ یہاں لفظ 'عِلْمٍ' کی تنکیر موقع کلام دلیل ہے کہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی یہ خدا کے عظیم و وسیع، محیط کل علم پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر بات قطعی اور اٹل ہے۔ خدا قیامت کے روز کی باتیں بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح کل اور آج کی باتیں جانتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی نے ان کو خیالی باتیں قرار دے کر ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو وہ سوچ لے کہ وہ دن دور نہیں جب وہ ایک ایک بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور پکار اٹھے گا کہ اللہ کے رسول نے جن جن باتوں کی خبر دی تھی سب سچی ثابت ہوئیں۔

'هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' ہدایت و رحمت کے دو لفظوں نے آغاز و انجام اور دنیا و آخرت دونوں

کو سمیٹ لیا ہے۔ یعنی یہ کتاب لوگوں کے لیے دنیا میں ہدایت ہے اور اس ہدایت کو اختیار کرنے کا ثمرہ آخرت میں رحمت ہے۔ 'یُؤْمِنُوْنَ' فعل، جیسا کہ ہم دوسرے محل میں واضح کر چکے ہیں، ارادۂ فعل کے معنی میں ہے، اس کا ترجمہ یوں کیجیے 'ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں'۔

'ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ' 'تاویل' کے لفظ پر ہم سورۂ آل عمران کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں جو قرآن سنا رہا ہے ہیں تو اٹل حقیقتیں لیکن چونکہ ابھی یہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئی ہیں بلکہ مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں اس وجہ سے منکرین ان کو خالی خولی دھمکی سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہ واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں تو ان کو دیکھ کر یقین کریں گے۔

'یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ' مطلب یہ ہے کہ جب یہ باتیں واقعات کی شکل میں ظاہر ہوں گی تو آج جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ پکار اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے جن باتوں سے ہمیں آگاہ کیا تھا وہ سب حقیقت ثابت ہوئیں۔ اس وقت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ ہے کوئی سفارشی جو ہماری سفارش کرے یا ہے کوئی صورت کہ ہم دنیا میں پھر جائیں اور کچھ نیکی کمائیں! لیکن ان کی یہ حسرت حسرت ہی رہے گی اس لیے کہ نیکی کی کمائی کا وقت نکل چکا ہوگا۔ جو وقت ان کو نیکی کمانے کے لیے ملا اس میں انھوں نے بدی کمائی اور جھوٹے سفارشیوں پر تکیہ کیے رہے۔ 'قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ' زندگی کی اصلی قیمت، جیسا کہ سورۂ العصر میں واضح فرمایا ہے، یہی ہے کہ اس میں نیکی کمائی جائے۔ جس نے نیکی نہ کمائی اس کی زندگی وبال بنی اور اس نے بڑے قیمتی سرمایہ سے اپنے لیے تباہی کا سودا کیا۔ 'ضَلَّ عَنْهُمْ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے فرضی معبود سب خواب و خیال ثابت ہوں گے اس لیے کہ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ تھی ہی نہیں کہ انھوں نے اپنے جی سے گھڑ کے ان کو خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا کہ خدا نے ان کو اپنا شریک و شفیع بنایا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۵۴-۵۸

اوپر بات شرک کی بے حقیقتی و بدانجامی پر ختم ہوئی تھی۔ آگے کی آیات میں توحید کے مضمون کی وضاحت فرما کر اس کی تکمیل کر دی کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور وہ اس کائنات کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ اپنے عرش حکومت پر متمکن ہو کر تمام کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ دن اور رات، سورج اور چاند، ستارے اور سیارے سب اسی کے احکام کی تعمیل میں شب و روز گردش میں ہیں۔ جس نے خلق کیا ہے اسی کا امر و حکم تمام کائنات پر جاری ہے اور خالق کائنات کے سوا دوسرا کوئی حق دار کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا کی خلق کی ہوئی کائنات میں اس کا حکم چلے؟ پھر یہ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے

کہ اس کو خلق کرنے والی ہستی بڑی ہی بافیض اور نہایت ہی بابرکت و رحمت ہستی ہے تو سراً و علانیۃً اسی کو پکارو اور امید و بیم ہر حال میں اسی سے لُو لگاؤ۔ خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک گرداننا خدا سے بغاوت اور اس کی سرزمین میں فساد برپا کرنا ہے اور خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس سے سرتابی کریں اور اس کی زمین میں فساد مچائیں۔

اس کے بعد بارش کی ایک تمثیل پیش کی ہے جس سے بیک وقت تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا کی رحمت اس کے نیکوکار بندوں سے بہت قریب ہے اس وجہ سے امید و بیم ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، خدا اور اُس کی رحمت کو دور سمجھ کر دوسروں کا سہارا نہیں پکڑنا چاہیے۔ یہ خدا ہی ہے جو زمین کے خشک ہو جانے اور تمھارے مایوس ہو جانے کے بعد اپنی رحمت کی گھٹائیں اٹھاتا اور تمام زمین کو جل تھل کر دیتا ہے۔

دوسری یہ کہ جس طرح تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ جب چاہے گا تمھارے مرکھپ جانے کے بعد تمھیں از سرِ نو زندہ اُٹھا کھڑا کرے گا۔

تیسری یہ کہ جس طرح بارش کا اثر مختلف صلاحیت کی زمینوں پر مختلف شکل میں نمایاں ہوتا ہے، زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے، بنجر زمین صرف خار و خس ہی اگاتی ہے اسی طرح قرآن کی شکل میں ہدایت و رحمت کی جو بارش اس زمین پر نازل ہوئی ہے اس سے بھی مختلف صلاحیت کی طبیعتیں مختلف اثر لیں گی، جنھوں نے اپنی فطرت کو مسخ ہونے سے بچایا ہے وہ اس سے فیض پائیں گے اور ان کے دل نورِ ایمان سے جگمگا اٹھیں گے لیکن جن کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ان کے اندر صرف کفر و عناد کی جھاڑیاں اگیں گی۔

آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
۵۴-۵۸ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ
تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۴﴾ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۵۵﴾ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا
وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ
اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ
فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ
الَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾ ع ۷ ۱۴

ترجمۂ آیات ۵۴-۵۸

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ ڈھانکتا ہے رات کو دن پر جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کیے جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔ بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، عالم کا رب! اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔ اور اسی کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔ ۵۴-۵۶

اور وہی ہے جو اپنے ابر رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب وگیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اور زرخیز

زمین کی پیداوار تو خوب اپجتی ہے اس کے رب کے حکم سے پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکر گزار بننا چاہیں۔ ۵۴-۵۸

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۵۴)

جو خالق ہے وہی رب ہے

'إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اہل عرب آسمان و زمین اور تمام دوسری چیزوں کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا رکھے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا خلق کر کے اس کے انتظام و انصرام کے مختلف شعبے اپنے دوسرے کارندوں میں تقسیم کر دیے ہیں اور اب ان شعبوں کے اصلی کرتا دھرتا وہی ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت ضروری ہے۔ وہی خدا کے قرب کا واسطہ ہیں اور رزق و فضل اور مال و اولاد کے خزانوں پر عملاً انہی کا تصرف ہے۔ اگر ان کو نہ راضی رکھا جائے تو اکیلے اللہ تعالیٰ سے کام نہیں چل سکتا۔ انہی کارندوں کو وہ ارباب، شرکاء اور شفعاء کا درجہ دیتے تھے اور گو نظری طور پر ان کی میتھالوجی میں خدا کو خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت حاصل تھی لیکن عملاً ان کی ساری وابستگی رب الارباب سے نہیں بلکہ ان فرضی ارباب ہی سے رہ گئی تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی گمراہی پر ٹوکا ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، وہی رب بھی ہے، جب خالق وہ ہے اور اس سے تمھیں انکار نہیں تو دوسروں کو رب کس منطق سے بنائے بیٹھے ہو۔

تخلیقِ کائنات میں تدریج و ارتقا کی حکمتیں

'فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ' میں ایام سے مراد یہ ہمارے چوبیس گھنٹے والے دن نہیں ہیں بلکہ اس سے خدائی دن مراد ہیں۔ خدا کی اسکیمیں اس کے اپنے دنوں کے حساب سے بروئے کار آتی ہیں جو ہمارے حساب سے، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہیں۔ دنیا کا چھ ادوار میں پیدا ہونا تورات میں بھی مذکور ہے اور قرآن میں بھی بلکہ جہاں تک اس کے تدریجی ارتقا کا تعلق ہے فلسفۂ جدید بھی بڑے شد و مد سے اس کا مدعی ہے۔ اس وجہ سے بجائے خود اس کائنات کا ارتقا قدیم و جدید میں متنازع فیہ نہیں ہے البتہ نظریۂ ارتقاء کی تقریر اس

کے عَلم برداروں کی طرف سے جس انداز میں کی جاتی ہے اس میں بہت سے منطقی خلا ہیں جو اس وقت تک نہیں بھر سکتے جب تک ان عقلی و فطری اصولوں کو تسلیم نہ کیا جائے جو قرآن نے اس ارتقا کے بیان فرمائے ہیں۔ ہم انشاء اللہ اس کے محل میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔

دلائلِ توحید

اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کو چھ دنوں، یا چھ ادوار میں پیدا کرنے کے بجائے اپنے ایک کلمۂ کُن سے آن کے آن میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کی قدرت سے بعید نہیں تھی۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ یہ چھ ادوار میں پیدا ہو۔ خدا نے اپنے خلق و تدبیر کے ہر شعبے میں جس طرح اپنی قدرت نمایاں فرمائی ہے اسی طرح اپنی حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں فرمائی ہیں اور اس کی ان شانوں کا نمایاں ہونا بھی انسان کے کمال عقلی و روحانی کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کے کمالِ قدرت کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ ہم نے سورۂ انعام کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں تھی کہ ہماری غذا کے لیے براہ راست آسمان سے روٹی برستی پھر یہ کیوں ضروری ہوا کہ ہوائیں چلیں، بادل اٹھیں، مینہ برسے، کھیتوں میں ہل چلیں، گندم بوئی جائے، انکھوے نکلیں، ڈنٹھل پیدا ہوں، اس میں برگ و بار نمایاں ہوں، فصل اپجے، خوشے نمودار ہوں، پھر ان میں دانے بیٹھیں، پھر گرم و خشک ہوائیں چلیں جو ان دانوں کو پکائیں اور اس طرح کہیں چھ مہینے کے گرم و سرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانہ کھیت سے کسان کے کھتے تک پہنچے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس طرح اس کائنات کی ایک ایک چیز خدا کی آیات خلق و تدبیر اور اس کے عجائبِ قدرت و حکمت کا ایک دفتر بن گئی ہے۔ انسان اس کے جس گوشے پر بھی نظر ڈالتا ہے اگر آنکھیں کھلی ہوئی اور عقل بیدار ہو تو معرفتِ الٰہی کا ایک دلبستان کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے نہ جانے کتنے بھیس بدلتی اور کتنے جامے تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے اور ہم ان کے اندر خدا کی نشانیوں کو دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں۔ جو حال اس دنیا کے ذرے ذرے کا ہے وہی حال بحیثیت مجموعی اس دنیا کا ہے یہ بھی ایک حادثہ کے طور پر یک بیک بن کر نہیں کھڑی ہو گئی ہے بلکہ اس کی تعمیر کرنے والے نے بڑی تدریج، حکمت اور بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف مراحل میں اس کو تکمیل تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ وہ انسان کے فرودگاہ ہونے کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ ہو گئی۔ یہ اہتمام و تدریج شاہد ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ ایک با غایت و با مقصد کارخانہ ہے اور ضرور ہے کہ ایک دن وہ غایت و مقصد ظہور میں آئے۔ اس نکتہ پر مفصل بحث ہم سورۂ ہود کی آیت ۷ کے تحت کریں گے جہاں اسی اہتمام کے پہلو سے جزا و سزا پر استدلال کیا ہے۔

تخلیقِ کائنات میں جو اہتمام ہے اس کا بدیہی نتیجہ

'ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' یہ اس شان و اہتمام کے ساتھ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کا ایک بدیہی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جس نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا سنوارا کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھے۔ اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ

ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تخت حکومت پر متمکن ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرمائے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے بعض جگہ 'اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' کے ساتھ 'یُدَبِّرُ الْاَمْرَ' بھی آیا ہے۔ خدا خلق تو کرے لیکن پھر اس کا انتظام نہ کرے یہ خدا پر نہایت ہی سفیہانہ تہمت ہے۔ ایک بادشاہ اگر بڑے اہتمام سے ملک حاصل کرے لیکن ملک حاصل کر کے کسی گوشے میں جا بیٹھے، اس میں امن و عدل کا اہتمام نہ کرے، مفسد [illegible] ہیں دھاندلی مچاتے پھریں تو ساری خلق اس کو نالائق بادشاہ کہے گی، پھر ایک معمولی بادشاہ کے لیے جو بات عیب میں داخل ہے آسمان و زمین کے خالق و مالک کے لیے وہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے؟ یہ مشرکین کے اس مزعومہ کی تردید ہے کہ خدا خالق تو ہے لیکن آسمان و زمین کو خلق کر کے اس نے عالم کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے شرکاء کے حوالے کر دیا ہے اور خود الگ تھلگ جا بیٹھا ہے۔ ساتھ ہی یہ ان کم سواد فلسفیوں کی بھی تردید ہے جو خدا کو صرف ایک گوشہ نشین علت العلل کا درجہ دیتے ہیں جس نے محرک اول کی حیثیت سے ایک حرکت تو پیدا کر دی لیکن پھر اس کو اس سے کچھ بحث نہیں رہی کہ اس کی اس حرکت کے کیا نتائج نکلتے ہیں اور اس کو کنٹرول کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ فرمایا کہ خدا کائنات کو پیدا کر کے عرش پر متمکن ہے اور کائنات کا انتظام فرما رہا ہے۔ عرش اقتدار کی تعبیر ہے اور استوا کے بعد جب 'علی' آتا ہے تو اس کے معنی تمکن کے ہو جاتے ہیں۔

'یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا'۔ 'حثیث' اور 'حثوث' کے معنی تیز اور سرگرم کے ہیں۔ یہ اس تدبیر و انتظام کی وضاحت ہو رہی ہے جو 'اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ' کے اندر مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نظام کائنات میں جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اس کے خالق ہی کی تدبیر و انتظام سے ہو رہی ہے۔ وہی ہے جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور اسی کے حکم سے اس سرگرمی سے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ 'وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ' وہی ہے جس نے سورج اور چاند اور دوسرے تمام نجوم و کواکب پیدا کیے۔ 'مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ' یعنی وہ اپنے اپنے معینہ فرائض اور اپنے اپنے معینہ حدود و قیود کے خدا کے حکم سے پابند ہیں اور پوری سرگرمی کے ساتھ شب و روز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ایک پل کے لیے بھی غافل ہوں یا بال برابر بھی اپنے حدود سے متجاوز۔

جو خالق ہے اسی کو حکومت کا حق ہے

'اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ' بیان واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی۔ یعنی جس نے یہ کائنات خلق کی ہے اسی کا امر و حکم اس کے گوشہ گوشہ میں جاری ہے، ذرہ ذرہ شب و روز اسی کے احکام کی تعمیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہے اور یہی حق بھی ہے کہ اسی کا امر و حکم اس کے ہر گوشے میں چلے اس لیے کہ جس نے خلق کیا ہے اس کے سوا کسی اور کا حکم اس میں چل کس استحقاق کی بنا پر سکتا ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ 'حَثِیْثًا' کے لفظ سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ ہر چیز پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دے رہی ہے، کسی چیز سے بھی نیم دلی یا سرد مہری کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ

اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کے لیے بھی خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے یہی رویہ زیبا ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت میں اسی طرح سرگرم ہو۔ دوسری بات یہ قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں رات کی سرگرمی کا ذکر تو فرمایا لیکن دن کی سرگرمی کا ذکر نہیں فرمایا درآنحالیکہ دوسرے مقام میں رات کے ساتھ دن کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۶۲۔ الفرقان' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں رات کے ذکر کے بعد سورج کا ذکر آگیا ہے جس سے متقابل پہلو خود بخود واضح ہو گیا۔

خدا اپنے جلال اور رحمت دونوں میں یکتا ہے

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ، تفاعل میں غایت درجہ مبالغہ کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے 'تَبٰرَكَ اللّٰهُ' کے معنی ہوں گے، بڑی ہی برکت و رحمت والی ہستی ہے اللہ۔ اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے خلق و تدبیر کی جو شانیں واضح فرمائی ہیں ان سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جس طرح خدا کی قدرت و عظمت کا اظہار ہو رہا ہے اسی طرح اس کی رحمت و ربوبیت، اس کے جود و نوال اور اس کی کرم نوازی و فیض بخشی کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یہ خدا کے باب میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اس قدر بڑھایا کہ اس کی صفات رحمت و برکت کا تصور اس کے نیچے بالکل دب کر رہ گیا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسایط کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کے باب میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ قرآن نے یہاں 'تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے اسی طرح اس کی بے پایاں برکت و رحمت پر بھی گواہ ہے تو اس سے مانگنے کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ خوف اور طمع، امید اور بیم ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی سے مانگو، جس طرح وہ اپنے جلال میں یکتا ہے اسی طرح اپنی رحمت میں بھی یکتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۵-۵۶)

خدا سے دعا کے آداب

'اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً'۔ 'تضرع'، 'ضراعت' سے ہے۔ اس کے معنی عاجزی، خوشامد، لجاجت، تعلق کے اظہار کے ہیں۔ یہ اظہار حرکات اور اداؤں سے بھی ہوتا ہے اور الفاظ و عبارات سے بھی۔ اس کی سب سے زیادہ موثر شکل وہ ہوتی ہے جب یہ الفاظ و حرکات دونوں میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ نمایاں ہو جس کی بہترین شکل اسلام میں نماز ہے۔ باوضو ہو کر مودّب کھڑا ہونا، ہاتھ باندھ لینا، سر نیوڑا

دینا، گھٹنے ٹیک دینا، ناک اور پیشانی خاک پر رکھ دینا، یہ تضرع کی حرکات اور ادائیں ہیں اور ان مختلف حرکات اور اداؤں کے ساتھ جو دعائیں اور تسبیحات پڑھی جاتی ہیں یہ سب اسی تضرع کی معنوی تعبیریں ہیں۔

'خُفْيَةً' کے معنی 'چھپکے' کے ہیں۔ یہ تضرع کے آداب میں سے ہے جو تضرع کے اخلاص کا بھی ضامن ہے اور اس کے وقار کا بھی۔ جو کام چھپکے چھپکے کیا جاتا ہے وہ ریا کے فتنہ سے محفوظ ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے اس وجہ سے اس کو سنانے اور اس سے فریاد کرنے کے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'خفیۃ' کا لفظ صرف ریا اور سوءِ ادب کے سدباب کے لیے ہے۔ اس سے اس جہر کی نفی نہیں ہوتی جو جماعتی دعاؤں یا بعض اوقات بندہ اپنی انفرادی مناجاتوں میں اختیار کرتا ہے۔ یہ جہر کی نفی نہیں بلکہ صرف اعتدال کی تاکید ہے۔ اس مضمون کی وضاحت انشاء اللہ بنی اسرائیل کی آیت 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ۱۱۰' کے تحت آئے گی۔

انسان کو نظام کائنات کا درس — الفاظ کی وضاحت کے بعد اب آیت کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ اوپر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے، اسی کے حکم سے ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں، خلق اور امر سب اسی کے اختیار میں ہے اور وہ بڑی ہی بافیض و بابرکت ہستی ہے۔ اب یہ 'اُدْعُوْا رَبَّكُمْ' سے وہ حق اور فرض بیان ہو رہا ہے جو اس رب عظیم و کریم کا بندوں پر عاید ہوتا ہے۔ وہ حق و فرض یہ ہے کہ اپنے اسی رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یعنی یہ استکبار اور یہ رعونت جس کا اظہار تمھاری طرف سے ہو رہا ہے یہ روش تمھارے لیے زیبا نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز خدا کے آگے سرنگندہ و سرنگوں اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم تگاپو ہے تو تمھاری کیا ہستی ہے کہ خدا کے آگے اکڑو اور سر اٹھاؤ۔ 'اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ'۔ خدا ان لوگوں کو کبھی پسند نہیں کرتا جو اس کے حدود سے تجاوز کریں۔ یہ نظام کائنات شاہد ہے کہ وہ کسی چیز کو اس کے حدود سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا اور اس دنیا کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ اس نے کبھی اکڑنے والوں اور حدود سے تجاوز کرنے والوں کو ایک حد خاص سے زیادہ مہلت نہیں دی۔

تکوینی توحید کی طرح تشریعی توحید بھی لازمی ہے — "وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید و توثیق منفی پہلو سے ہے۔ یعنی اپنے رب سے انحراف اختیار کر کے اس زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ قرآن میں مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے، یہ تو قائم ہی اس بنا پر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرہ اختیار میں بھی صرف اسی اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کی عبادت و اطاعت کریں، کسی اور کو اس عبادت و اطاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظام عدل و شریعت درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام و بقا کے لیے جس طرح تکوینی توحید ناگزیر ہے اسی طرح اس

زمین کے امن وعدل کے لیے خدا کی تشریعی توحید بھی لازمی ہے۔ خدا کے ملک میں کسی اور کو الٰہ و معبود بنانا اس کے ملک میں فساد و بغاوت برپا کرنا ہے جس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں۔

'لَا تُفْسِدُوْا' کے ساتھ 'بَعْدَ اِصْلَاحِهَا' کی قید اس فعل کی شناعت کے اظہار کے لیے ہے۔ یعنی ملک میں فساد پیدا کرنا بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہوا۔

کائنات کے صلاح و فساد کی بنیاد

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خالق کائنات نے جب اس دنیا کو بنایا تو اس کو بنا کر یوں ہی انتشار اور بدامنی کے حال میں چھوڑ نہیں دیا بلکہ آدمؑ اور ان کی ذریت کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی ان سے توحید یعنی اپنی ہی عبادت اور اپنی ہی اطاعت کا اقرار لیا۔ اس کا ذکر اسی سورہ کی آیات ۱۷۲، ۱۷۳ میں آگے آ رہا ہے۔ پھر ذریت آدم سے، جیسا کہ آیت ۳۵-۳۶ میں گزرا، یہ وعدہ فرمایا کہ تمھاری ہدایت کے لیے میں اپنے رسول بھیجوں گا، تم ان کی پیروی کرنا، جو ان کی پیروی کریں گے وہ فلاح پائیں گے، جو تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہ ہلاک ہوں گے۔ پھر اپنے اس وعدے کے بموجب اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے جن کی تفصیل آگے آیت ۵۹ سے آیت ۹۳ تک آ رہی ہے۔ ان رسولوں کی سرگزشتیں، جیسا کہ آیات ۹۶، ۷۴، ۸۵، ۱۰۰، ۱۰۲ سے واضح ہوگا، یہ دکھایا ہے کہ اولاد آدمؑ کے مختلف گروہوں نے جب جب اللہ کی صراط مستقیم سے ہٹ کر اس دنیا میں فساد برپا کیا ہے خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کو انذار کیا ہے اور جب انھوں نے اس انذار کی پروا نہیں کی ہے تو خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی ہے اور ان کی خلافت دوسروں کو سونپی ہے کہ دیکھے وہ اس خلافت کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ دنیا بار بار شیطان اور اس کی ذریات کی کوششوں سے بگڑی ہے اور بار بار انبیا و مصلحین کے ذریعہ سے اس کی اصلاح ہوئی ہے۔ اس پہلو سے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں جس قوم کو بھی اپنے پچھلوں کی خلافت ملی ہے ایک فساد کو مٹا کر اس کی اصلاح کی شکل میں ملی ہے اور اگر خلافت پانے والی قوم نے خلافت پا کر اس میں فساد برپا کیا ہے تو یہ اس نے ایک بگڑی ہوئی چیز کو نہیں بگاڑا ہے بلکہ ایک بنی ہوئی چیز کو بگاڑا ہے اور یہ چیز اس کے جرم کو سنگین سے سنگین تر بنا دیتی ہے۔

اجتماعی مصلحین کا ایک مغالطہ

جہاں تک رسولوں کا تعلق ہے ان کے اور ان کی امتوں کے باب میں مذکورہ بالا اصول بالکل اٹل ہے ان کے ذریعہ سے حق سورج کی طرح چمکتا ہوا نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے ہاتھوں جو نظام مٹتا ہے وہ باطل ہوتا ہے، جو قائم ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آج قوموں کے عروج و زوال کے معاملے میں قدرت کا قانون بدل گیا۔ آج بھی اگر کوئی قوم مٹتی ہے تو اتفاق سے نہیں مٹتی اور اگر کوئی قوم عروج پر آتی ہے تو اتفاق سے نہیں آ جاتی بلکہ ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج میں اصلاً اخلاقی عوامل ہی کام کرتے ہیں لیکن کسی قوم کا چند زندگی بخش عوامل

اخلاق کے سہارے عروج پر آجانا ایک اور چیز ہے اور کسی نظام کا حق ہونا ایک دوسری چیز۔ کسی قوم کا عروج اس بات کی دلیل تو ضرور ہے کہ اس کے اندر مغلوب و مفتوح قوم کے مقابل میں زندگی بخش عوامل اخلاق زیادہ ہیں لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہ قوم اور اس کا نظام سو فی صد حق ہے۔ ہمارے بہت سے اجتماعی مصلحین کو یہ اصول سمجھنے میں سخت مغالطہ پیش آیا ہے جس کے سبب سے وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ جو لوگ قومی تعصب میں مبتلا رہے انھوں نے ہمیشہ غالب قوم کے غلبہ کو اس کی چیرہ دستی اور کیادی پر محمول کیا، وہ اپنے تعصب کے سبب سے نہ تو اس اخلاقی برتری کو دیکھ سکے جو غالب قوم کے اندر موجود تھی اور نہ اس اخلاقی ضعف پر ان کی نظر پڑی جو ان کے اپنے اندر پایا جاتا تھا۔ اسی طرح جو لوگ مرعوب ذہن کے تھے انھوں نے ہر غالب کے غلبہ کو اس کے برحق ہونے کی دلیل سمجھا اور اس کے ہاتھوں جو فساد و باطل بھی دنیا میں برپا ہو گیا اسی کو نظام حق سمجھ کر اس کے گن گانے لگے۔ اس افراط و تفریط کا اثر قوموں کی تاریخ پر یہ پڑا کہ وہ بالکل غلط طریقہ پر مرتب ہو گئی جس سے صحیح نتائج نکالنا اور ان سے اجتماعی اصلاح میں فائدہ اٹھانا ناممکن ہو گیا۔ یہاں ہم اس اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ انشاء اللہ سورۂ روم کی تفسیر میں ہم اس پر شرح و بسط سے بحث کریں گے۔

امید اور بیم دونوں میں مرجع خدا ہی ہے

'وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ' یہ 'اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً' کا متقابل جملہ ہے۔ اس میں خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی تھی جو استکبار کی ضد ہے۔ اب یہ خدا کے پکارنے کے محرک کی وضاحت فرمائی جس سے شرک کے ہر جرثومہ کی جڑ کٹ گئی ہے۔ استکبار خدا سے بے پروا کرتا ہے۔ اگر اس کا سر کچل جائے تو انسان کے اندر فقر پیدا ہوتا ہے اور یہ فقر بندے کو خدا سے جوڑتا ہے۔ اس فقر کے دو پہلو ہیں۔ ایک خوف، دوسرا طمع، اپنے لفظوں میں ان کو امید و بیم سے تعبیر کر لیجیے۔ انسان کے اندرونی داعیات بھی انھی دو قسموں میں منقسم ہیں اور اس کے خارجی عوامل و محرکات کا بھی تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ وہ بھی یا تو بیم کے تحت آتے ہیں یا امید کے تحت۔ ہم بہت سی چیزیں، مادی اور معنوی دونوں قسم کی، چاہتے ہیں، ان کے ارمان رکھتے ہیں، ان کے آرزومند ہیں، اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں، مادی اور معنوی دونوں قسم کی، جن سے گریز کرنا چاہتے ہیں، جن سے اندیشہ رکھتے ہیں، جن کو دفع کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن ان دونوں ہی حالتوں کے لیے توحید کا تقاضا یہ بتاتا ہے کہ انسان صرف اللہ ہی کو اپنا مرجع و مولیٰ بنائے۔ جو کچھ چاہے اس کے لیے بھی خدا ہی سے رجوع کرے، جن سے اندیشہ محسوس کرے اس سے بچنے کے لیے بھی خدا ہی کی پناہ ڈھونڈے، اس لیے کہ دینے والا بھی وہی ہے، روکنے والا بھی وہی ہے، اس کے سوا نہ کوئی کسی خیر سے بہرہ مند کر سکتا، نہ کسی شر سے بچا سکتا۔ نیز خیر و شر کی معرفت کا حقیقی معیار بھی وہی ہے، امید و بیم دونوں میں اگر خدا ہی مرجع ہو اور اسی کی مرضی مطلوب ہو تو انسان کو یہ معین کرنے میں ذرا زحمت پیش نہیں آسکتی کہ کیا چیز چاہنے کی ہے اور اسے کس طرح چاہنا چاہیے اور کیا چیز بچنے کی ہے اور اس سے

کس طرح بچنا چاہیے ــــ یہ امر ملحوظ رہے کہ خوف اور طمع یہ دونوں ہی گھاٹیاں بڑی خطرناک ہیں۔ شیطان ان دونوں ہی سے انسان پر شب خون مارتا ہے اور کسی نہ کسی شرک جلی یا خفی میں لوگوں کو مبتلا کرکے رہتا ہے۔

حقیقی خوب کار

'اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنی امید و بیم دونوں کا مرجع اپنے رب کو بنالیں وہ درحقیقت محسن یعنی خوب کار ہیں اور اللہ کی رحمت ایسے خوب کاروں سے بہت قریب ہے۔ معلوم ہوا کہ مقام احسان پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم و رجا دونوں حالتوں میں اپنے رب کی طرف یکسو ہو۔ اگر یہ یکسوئی حاصل نہ ہو تو وہ مقام احسان سے دور ہے اور جو مقام احسان سے دور ہے وہ خدا کی رحمت سے بھی دور ہے۔ خدا کی رحمت قریب محسنین سے ہے۔ وہ جب کسی امید یا بیم میں اس کو پکارتے ہیں وہ اپنی رحمت سے ان کو بہرہ مند فرماتا ہے۔ یہاں زبان کا یہ قاعدہ ملحوظ رہے کہ لفظ رحمت کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے خبر کو مؤنث لانا ضروری نہیں ہوا۔ نیز فعیل کا وزن بعض حالات میں مذکر و مونث دونوں کے لیے یکساں آتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ (۵۷-۵۸)

امید و بیم دونوں میں خدا ہی کو مرجع بنانے کی تمثیل بارش سے

'وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ'۔'رَحْمَت' سے مراد یہاں بارش ہے۔ قرآن میں بارش کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس بات کی کہ خوف و طمع دونوں ہی حالتوں میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اس لیے کہ رحمت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ بارش، جس پر تمام دنیا کی زندگی کا انحصار ہے، ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک قطرہ اس کا اس زمین پر ٹپکا دے، یہ خدا ہی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتی ہیں، پھر خدا ان کو بے آب و گیاہ علاقوں کی طرف ہانک دیتا ہے اور وہاں ان سے پانی برسا دیتا ہے جس سے ہر قسم کے پھل اور ہر قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا ہے 'وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۲۸- شوریٰ (اور وہی ہے جو بارش اتارتا ہے بعد اس کے کہ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے) 'حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ'۔ 'اقلال' کے معنی کسی چیز کو اس طرح اٹھا لینا ہے گویا اس میں کوئی وزن ہے ہی نہیں۔ 'سَحَاب' 'سَحَابَۃ' کی جمع ہے لیکن صورۃً واحد ہے اسی وجہ سے لفظ کے لحاظ سے 'سُقْنٰهُ' میں ضمیر اس کے لیے واحد لائے، 'فَاَنْزَلْنَا بِهٖ' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح ہوائیں بوجھل بادلوں

کو اُٹھا لیتی ہیں گویا وہ روئی کے گالے ہیں اور پھر یہ ہم ہی ہیں کہ جدھر چاہتے ہیں ان کو ہانک کرلے جاتے ہیں اور جس جگہ چاہتے ہیں جل تھل کر دیتے ہیں، کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو اپنے پسند کردہ رخ پر موڑ سکے۔ پس امید و بیم ہر حال میں اسی سے لو لگاؤ، اس کے سوا کوئی اور متصرف اس کائنات میں نہیں ہے۔

قیامت کی یاددہانی بارش کی تمثیل سے

'كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' یہ اسی بارش کی تمثیل سے ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلادی ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش بھیج کر ایک بالکل مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو ہم ازسرِ نو زندہ کر دیتے ہیں اسی طرح ایک دن ہم تمام مُردوں کو زندہ کر دیں گے۔ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں روز دیکھ رہے ہو، مُردوں کو زندہ کر دینا اس کی قدرت سے کیوں بعید سمجھتے ہو؟ ہم نے تو یہ نشانیاں اس زمین میں نمایاں کی ہی اس لیے ہیں کہ ان آثار سے تم آخرت کے لیے یاددہانی حاصل کرو۔ 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' میں غایت بیان ہوئی ہے اس توجہ دہانی کی جو 'كَذٰلِكَ' کے اشارے میں مضمر ہے۔

'وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'طیب' اور 'خبیث' کے الفاظ جس طرح معنوی و اخلاقی اعتبار سے خبیث و طیب کے لیے آتے ہیں اسی طرح مادی اعتبار سے خبیث و طیب کے لیے بھی آتے ہیں۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ 'بَلَدٌ طَيِّبٌ' سے مراد زرخیز اور ذی صلاحیت زمین اور 'وَالَّذِيْ خَبُثَ' سے بنجر اور شور زمین ہے۔ پھر اس میں تقابل کے اصول پر جملہ کے پہلے حصہ میں 'نَكِدًا' کا متقابل لفظ محذوف ہے۔ 'نَكِد' کے معنی ناقص اور قلیل کے ہیں اس وجہ سے جملہ کے پہلے حصہ میں طیب اور کثیر کا مضمون محذوف ہے۔

مذکورہ تمثیل سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ

اب دیکھیے اسی بارش کی تمثیل سے ایک تیسری حقیقت کی طرف توجہ دلادی کہ خدا کا ابرِکرم تو خشک و تر ہر جگہ یکساں برستا ہے لیکن فیض بقدرِ استعداد پہنچتا ہے۔ جس طرح دیکھتے ہو کہ بارش ہوتی ہے تو زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے لیکن بنجر اور شور زمین یا تو کچھ اگاتی ہی نہیں یا اگاتی ہے تو بس یوں ہی کچھ خار و خس، اسی طرح قرآن کی صورت میں جو رحمت آسمان سے برسی ہے اس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا بلکہ استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پہنچے گا۔ جن کی فطری صلاحیتیں زندہ ہیں وہ تو باغ و چمن کی طرح لہلہا اٹھیں گے لیکن جنھوں نے اپنی صلاحیتیں ضائع کر دی ہیں ان سے عناد و عداوت کے خار و خس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھو۔ یہی حقیقت ایک حدیث میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی تمثیل یہ ہے کہ کسی خطۂ زمین پر بارش ہو تو جو ٹکڑا زرخیز ہوتا ہے وہ پانی کو قبول کر لیتا ہے اور خوب سبزہ اور نباتات اگاتا ہے۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو پانی کو روک لیتا ہے تو اللہ اس سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، لوگ اس سے پیتے ہیں، کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں اور اپنی فصلیں بوتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ٹکڑا ہوتا ہے جو محض چٹیل ہوتا ہے، نہ پانی کو روکتا، نہ سبزہ اگاتا، یہ تمثیل ہے ان لوگوں کی جو دین کی سمجھ حاصل کریں اور

ان کو نفع پہنچے اس چیز سے جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، پس وہ سیکھیں اور سکھائیں اور ان لوگوں کی جو اس کی طرف توجہ نہ کریں اور اس ہدایت کو قبول نہ کریں جس کو لے کر میں آیا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

دیکھا آپ نے، ایک ہی بارش کی تمثیل سے کتنے حقائق آشکارا ہوگئے! توحید کی دلیل بھی سامنے آگئی، امکان معاد اور وقوع قیامت کی نظیر بھی مل گئی اور ہدایت و ضلالت کے باب میں جو سنت اللہ مقرر ہے وہ بھی نمایاں ہوگئی۔ گویا سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیر بحث آئے تھے اصولاً وہ سب ہی بے نقاب ہوگئے۔ ہم کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ یہ کائنات پروردگار نے بنائی ہی ایسی شکل میں ہے کہ اگر انسان دیدۂ بینا رکھتا ہو تو پتا پتا، بوٹا بوٹا ان حقائق کی شہادت دے رہا ہے جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان کہاں ہیں!!

'کَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ'۔ 'تصریف' کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں قرآن نے آیات کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ جس طرح ہواؤں کی گردش سے اس کائنات میں قدرت و حکمت اور رحمت و نقمت کے گوناگون پہلو ظہور میں آتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے سے اپنی نشانیاں گوناگوں پہلوؤں سے نمایاں کرتا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں، پہچانیں اور ان کی قدر کریں۔ 'لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تصریف آیات، بہت بڑا احسان ہے بشرطیکہ اس کی قدر کرنے والے لوگ ہوں۔ لفظ 'شکر' کی اصل حقیقت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ قدر دانی ہے۔ اسی قدر دانی پر ہر نعمت کی افادیت کا انحصار ہے۔ اگر یہ قدر دانی موجود نہ ہو تو جس طرح بھینس کے آگے بین بجانا لاحاصل اسی طرح ایسے بیلوں کے آگے ایک پھول کے سو سو رنگ سے مضمون باندھنا لاحاصل!

۱۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۹-۹۳

اب آگے وہی انذار کا مضمون، جو اوپر سے چلا آ رہا ہے، تاریخی دلائل سے واضح کیا گیا ہے اور عرب کی پچھلی قوموں میں سے ایک ایک کو لے کر دکھایا ہے کہ کس طرح اللہ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا لیکن انھوں نے اقتدار پا کر ناشکری کی روش اختیار کی، زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا کیا، عدل و قسط کو درہم برہم کیا، بالآخر اللہ نے ان کے اندر اپنا رسول بھیجا جس نے ان کو توحید اور عدل و قسط کے قیام کی دعوت دی لیکن انھوں نے اپنے غرور اور گھمنڈ کے سبب سے نہ صرف یہ کہ رسول کی بات مانی نہیں بلکہ اس کے درپۓ آزار ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا۔ قریش کو یہ ساری تاریخ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ اب ان کا معاملہ بھی اسی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمے پیش ہو کر فیصل ہوئے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر انھوں نے

بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ ان کے لیے کچھ مختلف ہو۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہے۔ خدا جب کسی قوم میں اپنا رسول بھیج دیتا ہے تو اس قوم کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو وہ اصلاح قبول کرے یا ہلاکت، اس کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

یہ واضح رہے کہ آگے جن قوموں کی سرگزشتیں آ رہی ہیں اہل عرب ان سے واقف تھے لیکن یہ واقفیت دھندلی دھندلی مبہم روایات کی شکل میں تھی، خاص کر ان کا اخلاقی پہلو تو بالکل ہی مبہم تھا۔ قرآن نے ابہام کا پردہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو زندہ کیا اور ان کو دعوت دی کہ کان کھول کر ان سرگزشتوں کو سنیں اور ان سے عبرت حاصل کریں، یہ دوسروں ہی کی حکایت نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کی اپنی حکایت بھی ہے ——— اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۹-۹۳ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ
اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ
الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ
بِىْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ
رَبِّىْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ
اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى
الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
ع ۸ ۱۵ عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾
قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِىْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ
جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ
جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ
فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ
وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ
رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ
مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٧١﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٢﴾ ع وَاِلٰى ۹ ع ۱۶
ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ وقف لازم
اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ
اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّ
بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ
الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٧٤﴾
قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ
اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا

بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿٧٥﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ
وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٧٧﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَتَوَلّٰى
عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ
لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ
مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾ وَمَا كَانَ
جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڮ كَانَتْ مِنَ
الْغٰبِرِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ ع وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا ع ١٠ ١٢ ١٧
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨٥﴾ ج
وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ
وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَاِنْ كَانَ طَاۗىِٕفَةٌ

مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِيٓ أُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا
حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِينَ ﴿٨٧﴾ قَالَ الْمَلَأُ الجزء ٩
الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا
مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَآ أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِينَ ﴿٨٨﴾
قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُم بَعْدَ إِذْ نَجّٰنَا
اللّٰهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُونُ لَنَآ أَن نَّعُودَ فِيهَآ إِلَّآ أَن يَشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۚ
وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفٰتِحِينَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخٰسِرُونَ ﴿٩٠﴾
فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جٰثِمِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا مع
شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ
الْخٰسِرِينَ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّي
وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِينَ ﴿٩٣﴾ ع ١١ ١

ترجمۂ آیات ۵۹-۹۳

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کے تسلط سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ اے میرے ہم قومو، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے بلکہ میں تمام عالم کے رب کا رسول ہوں، تمہیں اپنے

رب کے پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تمھیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی یاد دہانی تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے آئی تاکہ وہ تمھیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے! پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ بیشک یہ لوگ اندھے تھے۔ ۵۹-۶۴

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی اور معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ اس کی قوم کے بڑوں نے، جنھوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے ہم قومو! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ تمھیں اپنے رب کے پیام پہنچا رہا ہوں اور تمھارا دیانت دار ناصح ہوں۔ کیا تمھیں یہ بات عجیب لگی کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی یاد دہانی تمھی میں سے ایک شخص کے واسطہ سے پہنچی تاکہ وہ تمھیں ہوشیار کرے۔ اور یاد کرو جب کہ اس نے تمھیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمھیں وسعت و کشادگی عطا فرمائی تو اللہ کی شانوں کو یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ تو تم جس عذاب کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو اس کو لاؤ اگر تم سچے ہو۔

اس نے کہا تم پر تمھارے رب کی جانب سے ناپاکی اور قہر مسلط ہو چکے ہیں۔ کیا تم مجھ سے کچھ فرضی ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری ! ۔ سو تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پس ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنے فضل سے نجات دی اور ان لوگوں کی ہم نے جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور یہ ایمان لانے والے لوگ نہیں تھے۔ ۶۵-۷۲

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے ایک واضح نشانی آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے کہ تمھارے لیے ایک نشانی ہو پس اس کو چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے پھرے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ تمھیں ایک دردناک عذاب آپکڑے گا۔ اور یاد کرو جب کہ خدا نے قوم عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا، تم اس کے میدانوں میں محل تعمیر کرتے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اودھم مچاتے نہ پھرو۔ اس کی قوم کے ان بڑوں نے جنھوں نے گھمنڈ کیا، ان زیردستوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے، کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا فرستادہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو اس پیام پر جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ متکبروں نے کہا کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔ تو انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور بولے کہ اے صالح، اگر تم خدا

کے فرستادہ ہو تو وہ عذاب ہم پر لاؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو۔ پس ان کو کپکپی نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ تو وہ ان کو چھوڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں نے تمھیں اپنے رب کا پیام پہنچا دیا اور تمھاری خیرخواہی کر دی لیکن تم خیرخواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ ۷۳-۷۹

اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! تم سے پہلے دنیا کے کسی نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ بڑی ہی اوندھی عقل کے بلکہ حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ اس پر اس کی قوم والوں نے جواب دیا تو یہ دیا کہ ان کو اپنی بستی سے نکالو، یہ بڑے پارسا بنتے ہیں۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو، اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی، نجات دی اور ان پر اچھی طرح پتھراؤ کر دیا تو دیکھو، مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ۸۰-۸۴

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمھارا معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح حجت آچکی ہے تو ناپ تول پوری کرو، لوگوں کی چیزوں میں کوئی کمی نہ کرو اور زمین میں، اس کی اصلاح کے بعد، فساد نہ برپا کرو۔ یہی تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور ہر راہ میں دھمکیاں دیتے، اہل ایمان کو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس راہ کو کج کرتے نہ بیٹھو۔ یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے تو تم کو خدا نے زیادہ کیا اور دیکھو فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا! اور جب کہ

تم میں سے ایک گروہ اس چیز پر ایمان لایا ہے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ فرمادے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور اس کی قوم کے بڑوں نے، جنھوں نے تکبر کیا، کہا کہ اے شعیب، ہم تم کو اور جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کے رہیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آجاؤ۔ اُس نے کہا کیا جب کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہوں تب بھی! ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنے والے ٹھہریں گے اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی۔ یہ ہم سے تو ہونے کا نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارے رب ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے۔ ہمارے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے اور ان بڑوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے کفر کیا، کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے تو ان کو کپکپی نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے شعیب کی تکذیب کی گویا کبھی اس بستی میں بسے ہی نہیں، جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی نامراد ہوئے تو وہ ان کو یہ کہہ کر چھوڑ کر چل دیا کہ اے میرے ہم قومو، میں نے تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچادیے، تمھاری خیر خواہی کر دی تو اب میں کفر کرنے والوں کا غم کیوں کروں! ۸۵-۹۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حضرت نوحؑ اور ان کی دعوت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ الاٰیۃ: اس سورہ میں چونکہ قریش کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے

پہلے انہی قوموں کو لیا ہے جو عرب کے شمال یا جنوب یا شمال مغرب میں نامور ہوئیں اور جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ ترتیبِ بیان بالکل تاریخی ہے اس وجہ سے قومِ نوح کو سب سے پہلے لیا۔ ہر قوم کی سرگزشت میں سے صرف اتنا ہی حصہ نمایاں کیا ہے جتنا انذار کے مقصد کے لحاظ سے ضروری تھا۔

انبیاء کی دعوت کی مشترک حقیقت

فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ تمام فساد فی الارض کی جڑ شرک ہے۔ کسی قوم کے شرک میں مبتلا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظریات و عقائد اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اعمال و اخلاق ہر چیز میں فطرت کی صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئی اور اب زمین میں اس کا بڑھنا کسی خیر و صلاح کا بڑھنا نہیں بلکہ شر و فساد کا بڑھنا ہے اور جب تک یہ قوم باقی رہے گی اس کے ہاتھوں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں فساد ہی کو فروغ حاصل ہو گا۔ اس وجہ سے اللہ کے رسول اپنی اصلاح کی دعوت اسی اصل نقطہ سے شروع کرتے ہیں اور یہ چیز انبیاء و رسل کی دعوت کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی نبی کی دعوت بغیر اس خصوصیت کے پائی جائے۔

اللہ کے رسول دو عذابوں سے ڈراتے ہیں

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ یہ وہ اصل انذار ہے جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو سنایا کہ اگر تم شرک سے تائب ہو کر خالص اللہ ہی کی عبادت و اطاعت کی راہ پر نہ آ گئے تو بس سمجھ لو کہ تم پر ایک ہولناک دن کا عذاب نازل ہوا ہی چاہتا ہے۔ ہولناک دن سے مراد یہاں دنیوی عذاب کا ہولناک دن ہے۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ اللہ کے رسول اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کے لازمی نتیجہ کے طور پر دنیا میں آتا ہے اور دوسرے اس عذاب سے جس سے جزا و سزا کے فیصلہ کے دن آخرت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ عذابِ دنیا کی طرف اشارہ ہے۔ اس کو ہولناک دن سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ رسول کی تکذیب کے نتیجے کے طور پر جو عذاب آتا ہے وہ تذکیر و تنبیہ کی نوعیت کا عذاب نہیں ہوتا بلکہ یہ عذاب اس قوم کی جڑ کاٹ دیا کرتا ہے جس کے بعد قومی حیثیت سے اس کا نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتا ہے۔ سورۂ شعراء میں حضرت ہودؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۱۳۵۔ شعراء۔ پھر ان کی قوم کا جواب اور اس جواب کی پاداش میں ان پر دنیا میں عذاب کا آنا یوں بیان ہوا ہے۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۱۳۸-۱۳۹ (اور ہم پر ہرگز عذاب نہیں آئے گا، تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا، پس ہم نے ان کو ہلاک کر چھوڑا اور بے شک اس میں بہت بڑی نشانی ہے)

حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا سوال و جواب

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ الاية۔ مَلَاٌ کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ یعنی تمہاری ان باتوں کی بنا پر ہم تم کو کھلی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اول تو تم نے باپ دادا کے دین کی تحقیر کی کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ان کا تم انکار کر

رہے ہو، پھر تم یہ ہے کہ ہمارے اوپر عذاب الٰہی نازل ہونے کی دھمکی بھی سنا رہے ہو درآنحالیکہ ہمارے حالات تم سے اور تمھارے نام لیواؤں کے حالات سے ہر اعتبار سے اچھے ہیں۔

'قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ الاٰية' حضرت نوحؑ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے کوئی سرپھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو، میں تمام عالم کے رب کی طرف سے تمھارے پاس پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں اور جو کچھ تمھیں سنا رہا ہوں وہ بے کم وکاست خدا ہی کی طرف سے سنا رہا ہوں، کوئی بات اپنی طرف سے نہیں سنا رہا ہوں۔

'اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ' یہ خدا کا پیغام بھی ہے اور میری طرف سے تمھارے حق میں انتہائی خیرخواہی بھی کہ تمھاری ضد اور ہٹ دھرمی، ناقدری و دل آزاری، دشمنی و بیزاری کے باوجود تمھارے پیچھے پڑا ہوا ہوں اور تمھارے ہاتھوں سب کچھ جھیل رہا ہوں۔ جذبۂ ہمدردی و خیرخواہی کے سوا کسی اور جذبے کا میری اس تمام تگ و دو میں کوئی شائبہ نہیں۔ بس یہ اندیشہ اور یہ غم ہے کہ تم کہیں خدا کی آخری پکڑ میں نہ آجاؤ۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو اس وجہ سے تمھیں عذاب کا ڈراوا عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن میں خدا کی طرف سے وہ بات بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تم اپنے ظاہر کی چمک دمک کے ساتھ اگر اپنے ان روگوں سے بھی باخبر ہوتے جو تم نے اپنے سفید کپڑوں کے نیچے چھپا رکھے ہیں تو تمھیں اندازہ ہوتا کہ میں کتنی سچی بات کہہ رہا ہوں۔

'اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ الاٰية' یعنی کیا میری بات ماننے میں یہ چیز تمھیں مانع ہو رہی ہے کہ اللہ نے تمھیں میں سے ایک شخص پر تمھارے لیے یاددہانی اتاری تاکہ وہ سامنے کے خطرے سے تمھیں آگاہ کر دے، تاکہ تم اللہ سے ڈرو اور اس کی رحمت کے سزاوار بنو!۔ یہاں سوال اٹھا کر بات چھوڑ دی ہے، جواب نہیں دیا ہے، اس لیے کہ انداز کلام اظہارِ حسرت وافسوس کا ہے۔ اس اسلوب بیان میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور و انانیت کو راہ نہ دیتے، تو یہ چیز تمھارے لیے تعجب اور استکبار کے بجائے ممنونیت اور شکرگزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمھارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمھیں نجات کی راہ دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمھارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میرا ماضی و حاضر اور میرا اخلاق وکردار سب تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری زبان تمھاری زبان اور میرا دل تمھاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اتمام حجت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمھاری اپنی ہی زبان اور تمھارا اپنا ہی دردآشنا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام میں یہ ساری داستان مضمر ہے اور یہ اضمار ہی اس محل میں تقاضائے بلاغت ہے۔ آخر ان لوگوں کو غمِ دل سنانے سے کیا حاصل جو سننے سے پہلے ہی اعتراض و نکتہ چینی کے لیے پر تولے ہوئے ہوں۔

'لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ' سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کے انذار کا اصل مقصد لوگوں کے اندر خشیت و تقویٰ پیدا کرنا ہوتا ہے اور یہی خشیت و تقویٰ ہے جو دنیا اور آخرت میں لوگوں کو رحمت الٰہی

کا سزاوار بناتی ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ نشانی عذاب اور فرشتوں کے مشاہدے کے منتظر ہوتے ہیں وہ درحقیقت اپنے لیے عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔

'فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ الاية' یعنی بالآخر وہ بات ہو کے رہی جس سے حضرت نوحؑ نے ڈرایا تھا۔ جب قوم نے تکذیب کر دی اور حضرت نوحؑ کی طویل جد و جہد کے بعد بھی اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہ ہوئی تو ان لوگوں کے سوا جنھوں نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں پناہ لی سب کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ اس طوفان کی نوعیت پر ہم اس مقام میں بحث کریں گے جہاں قرآن نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ یہاں صرف یہ بات یاد رکھیے کہ غرق صرف وہ لوگ کیے گئے جو پیغمبر اور آیات الٰہی کی تکذیب پر اڑے رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ پیغمبر کی تکذیب کے نتیجے میں جو عذاب آتا ہے وہ انھی لوگوں پر آتا ہے جن پر پیغمبر اپنی حجت پوری کر دیتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد تھی۔ اس علاقہ کے سوا اس زمانے میں کہیں اور انسانی آبادی تھی یا نہیں؟ یہ سوال تاریخ کے ایک ایسے دور سے متعلق ہے جس کا تعلق حقائق سے زیادہ قیاسات اور تخمینوں سے ہے۔ ہم یہاں اس سوال پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ یہ بات سنتِ الٰہی کی اٹل حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ عذاب صرف انھی لوگوں پر آیا جنھوں نے حضرت نوحؑ کی تکذیب کی۔

عذاب اور ابتلا میں فرق

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عذاب اور ابتلا میں فرق ہوتا ہے۔ ایک تو یہ شکل ہوتی ہے کہ کسی قوم پر کوئی مصیبت، قحط، وبا، زلزلہ، طوفان وغیرہ کے قسم کی اللہ تعالیٰ اس لیے بھیجتا ہے کہ اہلِ غفلت اپنی غفلت کی نیند سے بیدار ہوں۔ اس قسم کے ابتلائی مصائب جب نازل ہوتے ہیں تو ان میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی آفت صرف مجرموں ہی تک محدود رہے بلکہ اچھے بُرے سب ان کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اس کے اعمال کی پاداش میں، اتمامِ حجت کے بعد، کوئی فیصلہ کن عذاب بھیجتا ہے۔ اس صورت میں عذاب کی زد سے وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو اصلاح کرنے والے یا اصلاح کرنے والوں کے پیرو ہوتے ہیں۔

عقل اور دل کے اندھوں کے ساتھ خدا کا معاملہ

'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ'۔ 'عمون'، 'عمی' کی جمع ہے۔ یہ لفظ آنکھ کے اندھوں کے لیے بھی آتا ہے اور عقل و دل کے اندھوں کے لیے بھی۔ یہاں یہ عقل و دل کے اندھوں کے لیے آیا ہے۔ یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا بیڑا غرق کر دیا؟ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ یہ عقل و دل کے اندھے تھے۔ اللہ کا رسول اتمامِ حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس ذریعہ کے بروئے کار آ جانے کے بعد قانونِ الٰہی میں کوئی اور چیز ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کا اتمامِ حجت کے لیے بروئے کار آنا ضروری ہو اس وجہ سے رسول کے انذار کے بعد بھی جو لوگ آنکھیں نہیں کھولتے وہ دنیا میں اپنے وجود کی خود نفی کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قدرت کیوں باقی رکھے جن کے دل کی آنکھیں چوپٹ ہو چکی ہیں۔

قوم عاد کی سرگزشت اور حضرت ہودؑ کی دعوت

'وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ..... اَفَلَا تَتَّقُوْنَ'۔ 'عاد' عرب کی قدیم اقوام میں سے ہیں۔ ان کا تعلق سامی نسل سے ہے۔ ان کا مسکن جنوبی عرب میں احقاف کا علاقہ تھا۔ قرآن کے الفاظ 'جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ' سے مترشح ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد اس قوم کے پیشروؤں میں سے کچھ لوگوں نے جنوبی عرب کی طرف ہجرت کی اور وہاں رفتہ رفتہ بڑی قوت و شوکت حاصل کر لی۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنے دبدبہ اور صولت کے لیے بھی۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہودؑ کو مبعوث فرمایا۔ 'اَخَاهُمْ' کے لفظ سے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی طرف دوسرے مقامات میں 'رَسُوْلًا مِّنْهُمْ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ 'رسول' کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے۔ اس کی طرف ہم نے اوپر بھی اشارہ کیا ہے اور سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اگرچہ ہر احسان کی طرح قوموں نے اس احسان کی بھی ہمیشہ ناقدری ہی کی ہے۔

'اَفَلَا تَتَّقُوْنَ' یعنی کیا تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ بالکل اسی محل میں حضرت نوحؑ نے 'اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ' فرمایا ہے۔

'قَالَ الْمَلَاُ ..... اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ' یعنی یہ جو تم ہم کو قہر و عذاب سے ڈراتے ہو یہ محض تمہاری خرد باختگی ہے۔ ہماری یہ ترقیاں ہمارے مستحق عذاب ہونے کی علامت ہیں، یا منظورِ نظر اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی! 'وَاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ' یعنی یہ جو تم دعویٰ کر رہے ہو کہ خدا کے فرستادہ ہو اور ہمارے پاس تم کو خدا نے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے، یہ محض تمہاری دھونس ہے اور ہم تم کو بالکل جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔

'اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ' ناصح کے ساتھ 'امین' کی صفت یہاں اسی طرح آئی ہے جس طرح سورۂ شعرا میں ہے۔ 'اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ' ۱۴۳۔ شعرا۔ امانت، خیانت کا ضد ہے۔ رسول کی ایک بڑی نمایاں صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ امین ہوتا ہے۔ یعنی جو پیغام اس کے حوالہ کیا جاتا ہے وہ پوری امانت داری کے ساتھ اس کو پہنچاتا ہے۔ اس میں سرِمو کمی بیشی نہیں کرتا۔

'وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ'۔ قومِ نوحؑ کے بعد عاد کو خلافت دیے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو بعینہٖ اسی علاقے میں اقتدار حاصل ہوا جس میں قومِ نوحؑ کو حاصل ہوا۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ قومِ نوحؑ بالکل شمال میں تھی اور عاد کا علاقہ عرب کا جنوبی علاقہ تھا۔ اس خلافت کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح قومِ نوحؑ کو اقتدار و تمکن حاصل ہوا اسی طرح ان کے بعد تم کو حاصل ہوا۔ اس یاددہانی میں حضرت ہودؑ نے قوم کو اللہ تعالیٰ کا احسان بھی یاد دلایا ہے اور ان کو تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ احسان تو واضح ہے کہ جو تمکن و اقتدار قومِ نوحؑ کو حاصل تھا وہ ان کو حاصل ہوا اور تنبیہ یہ ہے کہ جب تم قومِ نوحؑ کے اقتدار کے وارث

ٹھہرائے گئے ہو تو ان کی سرگزشت اور ان کے انجام کو بھی یاد رکھو۔ اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس انجام سے وہ دوچار ہوئے تم اس انجام سے بچ جاؤ۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

'وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً'۔ 'خلق' کے معنی یہاں ساخت کے ہیں مثلاً وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۱۱۹۔ نساء (میں ان کو سمجھاؤں گا بس وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو مسخ کریں گے۔ 'ساخت' سے مراد ظاہر ہے کہ باطنی اور ظاہری دونوں ہی ساخت ہے اس لیے کہ شیطان کے ایما سے مشرکوں نے اپنی فطرت کو بھی مسخ کیا اور اپنے بتوں کی خوشنودی کے لیے، جیسا کہ قرآن مجید میں اشارہ ہے، چوپایوں کے کان بھی کاٹے۔ 'بَسْطَةً' اور 'بصطة' دونوں ایک ہی لفظ ہے۔ اس کے معنی کشادگی، وسعت اور پھیلاؤ کے ہیں۔ ظاہری اور باطنی دونوں ساختوں میں پھیلاؤ اور کشادگی زیادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو خدا نے جسمانی اور عقلی دونوں اعتبار سے تفوق و برتری عطا فرمائی۔ عرب کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد صحتِ جسمانی کے اعتبار سے بھی نمایاں تھی اور اپنے عقلی کارناموں کے اعتبار سے بھی اس کی بڑی دھاک تھی۔ بقرہ میں طالوت کے متعلق فرمایا ہے 'وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ' وہی بات یہاں 'زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً' سے تعبیر ہوئی۔

'فَاذْكُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'۔ 'اٰلَآء' جمع ہے اِلی، اِلَی، اَلی کی۔ اس کے معنی عام طور پر اہل لغت نے نعمت کے لیے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنی کرشمہ، شان، کارنامہ اور اعجوبہ کے ہیں۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس لفظ کی تحقیق بیان کی ہے۔ انھوں نے مشہور شعرائے جاہلیت کے دس شعر نقل کیے ہیں جن سے وہی معانی نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

حضرت ہودؑ کی یہ بات بھی اپنے اندر امتنان اور تنبیہ دونوں ہی کے پہلو رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمھیں جن جسمانی و عقلی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے ان کی قدر کرو، ان کا شکر ادا کرو، ان کے سبب سے فتنے میں نہ پڑو۔ خدا کی شانوں، عظمتوں اور قدرتوں کو یاد رکھو۔ یہی راستہ فلاح کا راستہ ہے۔ اگر تم نے اکڑ دکھائی تو یاد رکھو، خدا کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہے۔

'قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا'۔ اس فقرے میں قوم کا غصہ اور طنز دونوں مضمر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم رسالت کے مدعی ہو کر اس لیے تشریف لائے ہو کہ ہم تمھاری دھونس میں آ کر ان معبودوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ تم سے توقع تو اس بات کی تھی کہ دین آبائی اور قوم کی عزت بڑھاؤ گے لیکن تم سب کے دشمن بن کر اٹھے۔

'فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ'۔ تو سن رکھو کہ تمھاری عذاب کی ان دھمکیوں سے ڈر کر ہم اپنے بزرگوں کے دین سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں۔ اگر اس جرم میں ہم پر عذاب آنے والا ہے تو وہ

عذاب لاؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

'قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ' ۔ 'قَدْ وَقَعَ' اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جیسے 'اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ' ہے یعنی اب یہ چیز لازم ہوگئی، واجب ہوگئی، تم اس کے مستحق ہوگئے، بس صرف انتظار باقی رہ گیا ہے۔ 'رِجْسٌ' کے معنی گندگی اور ناپاکی کے ہیں اور اس سے مراد یہاں کفر و شرک اور اعمال و عقائد کی گندگی و ناپاکی ہے۔ 'رِجْسٌ' اور 'غَضَبٌ' میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اس میں دیر نہیں ہے، اس کو آیا ہی سمجھو، اس لیے کہ جس ناپاکی و گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ 'رِجْسٌ' کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقۂ عذاب کو دور نہ سمجھو۔

'اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ' یہ قوم کی اس بات کا جواب ہے کہ بھلا ہم اپنے ان معبودوں کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جن کو ہم باپ دادا کے زمانے سے پوجتے آئے ہیں؟ فرمایا کہ تمہاری یہ حجت بالکل بے بنیاد ہے۔ تم جن چیزوں کو پوجتے ہو ان کے نام تو بے شک تم نے کچھ رکھ چھوڑے ہیں لیکن ان ناموں کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی دلیل نہ عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر تم ان کو معبود بنائے بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو؟ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم مانتے ہی ہو، وہ نزاعی چیز نہیں ہے، اس کی دلیل تمہارے پاس بھی موجود ہے، رہے تمہارے یہ اصنام خیالی تو ان کے حق میں کیا دلیل ہے جو تم پیش کر سکتے ہو۔

'فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ' مطلب یہ ہے کہ اب اگر عذاب دیکھ کر ہی ماننا ہے تو عذاب کا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ جہاں تک اس کے اسباب کا تعلق ہے وہ تو تم نے سب فراہم کر چھوڑے ہیں اس وجہ سے اس کا آنا تو امر قطعی ہے۔ لیکن عذاب لانا میرا کام نہیں ہے، خدا کا کام ہے۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔

'فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ' یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو رسول کے ذریعے سے قوم پر حجت تمام کر دینے کے بعد لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اور اس کے ساتھیوں کو اپنے فضل خاص سے، اپنی حفاظت میں لے کر علاقۂ عذاب سے نکال دیتا ہے اور رسول کے تمام جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو اس وقت نازل ہوتا ہے جب مخاطب قوم اپنی ہٹ اور ضد سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت ایمان کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے۔ 'وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ' سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قوم ثمود اور حضرت صالحؑ کی سرگزشت

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ثمود، عاد کے بقایا میں سے ہے۔ ان کو عاد ثانی کہتے بھی ہیں۔ ان کا مسکن عرب کے شمال مغرب میں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ رہے ہوں انھوں نے جنوب سے شمال مغرب کی طرف ہجرت کی ہو اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ عاد و ثمود کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی سے بیان ہوئے ہیں۔ بعض شاعر تو ان دونوں قوموں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا ان کے درمیان کوئی فرق سرے سے ہے ہی نہیں۔ دونوں کے لیڈر — قیل اور قدار — جن کے ہاتھوں ان قوموں پر تباہی آئی، عربی ادب میں ضرب المثل ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔

قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ یہ حضرت صالحؑ کی طرف سے قوم کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے۔ حضرت صالحؑ نے قوم کو بار بار خدا کے عذاب سے ڈرایا کہ یہ نہ سمجھو کہ آج جس عیش و آرام میں مگن ہو، جن باغوں اور چشموں میں عیش کر رہے ہو، جن کھیتوں اور فصلوں کی بہاریں لوٹ رہے ہو، جن تعمیرات اور ترقیوں میں گم ہو، یہی لیل و نہار ہمیشہ رہیں گے۔ خدا کی پکڑ سے بچو، میری بات مانو اور اپنے بے لگام اور بگٹٹ لیڈروں کی پیروی میں جو خدا کی زمین میں فساد برپا کر رہے ہیں، اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں نہ جھونکو۔ قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تم تو ہمیں ایک سحر زدہ اور خبطی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہم تمھاری یہ لن ترانیاں کس طرح مان لیں جب کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ ہم تو تمھاری بات اس وقت باور کریں گے جب تم اس عذاب کی کوئی نشانی لاؤ جس کے تم ہمیں ڈراوے سنا رہے ہو۔ ان کے اس مطالبہ کے جواب میں حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ یہ تمھارے لیے عذاب الٰہی کی نشانی ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو بس سمجھ لو کہ تم پر عذاب آ دھمکے گا۔ اس کو عذاب کے بند کی دیوار سمجھو، اگر تم نے اس دیوار کو توڑا تو تم کو قہر الٰہی کے سیلاب سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔

اس اونٹنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے مقصود اللہ کے لیے اس کی تخصیص کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ یہ خدا کی نذر اور اس کے لیے نامزد ہے۔ یہ تخصیص اور نامزدگی اسی نوعیت کی تھی جس طرح کی تخصیص اور نامزدگی ہمارے ہاں ہدی اور قلائد کے جانوروں کی ہوتی ہے۔ جس طرح اسلام میں ہدی و قلائد پر حملہ کرنا ایک عظیم جرم ہے اسی طرح حضرت صالحؑ نے اس اونٹنی کے بابت فرمایا کہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے، یہ امان کی دیوار ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو میں جس عذاب سے تم کو آگاہ کر رہا ہوں وہ تم پر ٹوٹ پڑے گا۔

اونٹنی کو نامزد کرنے کی مصلحت

اس اونٹنی کو حضرت صالحؑ نے ایک احساس پیما آلہ (FEELER) کی حیثیت سے نامزد کیا تھا کہ اس تاکید و تنبیہ کے باوجود اگر انھوں نے اس کو ہلاک کر دیا تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہو گا کہ اب یہ ظالم

لوگ ان کو بھی نعوذ باللہ جھوٹا سمجھ کر قتل کرنے کی جسارت کر گزریں گے۔ سنت الٰہی کے تحت کسی قوم کی جرأت وجسارت کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور قوم پر عذاب آتا ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات کہیں نہیں نکلتی کہ یہ اونٹنی اپنی خلقت کی اعجوبگی کے پہلو سے کوئی نشانی تھی بلکہ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ سے صاف واضح ہے کہ وہ گزند پہنچائے جانے کے انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے نشانی تھی۔ جہاں تک علم ہے اس اونٹنی کا کسی پہاڑ یا پہاڑی سے پیدا ہونا کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ یہ اونٹنی ایک پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ آیت کے معنی نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اونٹنی قوم کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایک نشانیٔ عذاب کی حیثیت سے نامزد کی گئی تھی چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈر نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس کے تیسرے دن عذاب الٰہی آ دھمکا۔ یہ واقعہ قرآن میں جستہ جستہ مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ ہم یہاں تقریب فہم کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ
لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ
رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۝ فِيْ
جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ
طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ
الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝
الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا
يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ
الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا
فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝
قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ
شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوْهَا

ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی، جب کہ ان کے
بھائی صالح نے کہا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تمھاری
طرف خدا کا ایک رسول ہوں امانت دار تو اللہ سے
ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں اس پر تم سے کسی صلے
کا طالب نہیں ہوں۔ میرا صلہ تو بس عالم کے رب
ہی کے ذمہ ہے۔ کیا تم جس عیش و تنعم میں یہاں ہو
اس میں چھوڑے رکھے جاؤ گے؟ باغوں اور چشموں میں،
کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے گچھے بوجھ سے ٹوٹے
پڑ رہے ہیں؟ اور تم پہاڑوں میں خوش خوش گھر تراشتے
رہو گے؟ تو اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو، اور
ان بے قیدوں اور مطلق العنانوں کے کہے میں نہ آؤ
جو ملک میں فساد مچاتے ہیں اور کوئی اصلاح کرنے
پر آمادہ نہیں۔ انھوں نے جواب دیا تم پر تو کسی نے جادو
کر دیا ہے تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو تو اگر تم
سچے ہو تو کوئی نشانی دکھاؤ۔ اس نے کہا یہ اونٹنی ہے
ایک دن پانی کی باری اس کی اور ایک روز مقررہ کی باری

بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(۱۴۱-۱۵۸ شعراء)

تمہاری اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچانا ورنہ ایک ہولناک دن کا عذاب تم کو آ پکڑے گا۔ تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، پھر انھیں پچھتانا پڑا ان کو عذاب نے آ پکڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانی ہے اور ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں تھی۔

مطالبۂ عذاب کے جواب میں عذاب کے بجائے ایک نشانیٔ عذاب کی نامزدگی اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کی دلیل تھی۔ وہ قہر میں دھیما اور رحمت میں جلدی کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ لوگوں کو مزید مہلت دے کہ اب بھی وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں لیکن انھوں نے متنبہ ہونے کے بجائے جسارت کا آخری قدم اٹھا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ اس کے بعد اگرچہ کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی تاہم قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ خطرے کی حدود لانگ جانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو تین دن کی مہلت دی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنا چاہیں تو کر لیں۔

اونٹنی سے متعلق حضرت صالحؑ نے یہ ہدایت جو فرمائی کہ یہ پورے علاقے میں چھوٹی پھرے، کوئی اس سے تعرض نہ کرے اور چشمے پر اس کے پانی پینے کا دن بالکل الگ ہو، اس دن دوسرے لوگ اپنے جانوروں کو گھاٹ پر نہ لے جائیں، یہ ہدایت قوم کی آزمائش کے لیے تھی کہ ان کے اندر جو کھوٹ اور عناد ہے ابھر کر سامنے آ جائے۔ کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ - اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہ لوگ عاد کے بقایا میں سے تھے اور ان کا علاقہ عرب کے شمال مغرب میں حجر کا علاقہ تھا۔ ان لوگوں کو وہاں بڑا عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ان کی بہت سی تعمیری یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ قریش کے قافلے اپنے شام کے سفر میں ان کی بستیوں پر سے گزرتے تھے اس وجہ سے ان کی سرگزشت ان کے لیے شنیدہ بھی تھی اور دیدہ بھی۔ حضرت صالحؑ نے ان کو جو عاد کی خلافت یاد دلائی اس کا مقصد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اپنے اقتدار کے نشہ میں خدا کے اقتدار کو نہ بھولو، اس نے جو معاملہ عاد کے ساتھ کیا، وہی تمہارے ساتھ کرے گا۔ وہ ایک ہی ترازو سے سب کے لیے تولتا ہے۔

تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا۔ 'سھل' اور 'جبل'، دونوں متقابل الفاظ ہیں 'سھل'، پہاڑی علاقے کے مقابل میں میدانی علاقہ کو کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے تمدنی اور تعمیری اعتبار سے، اپنے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ میدانی علاقوں میں بھی انھوں نے عالیشان محل تعمیر کیے اور پہاڑی علاقوں میں بھی پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بنائے۔ ان کے دور کے بعض تعمیری آثار آج بھی موجود ہیں جو فن تعمیر میں ان کے کمال کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کے ان تمام تعمیری ولولوں پر عین ان کے دورِ عروج

میں ماتم کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عالیشان اور لق و دق عمارتیں بنانا قوم کے عروج کی نہیں بلکہ تمدن کے فساد اور قوم کے زوال کی نشانی ہے۔ یہی فلک بوس عمارتیں بالآخر اس کے عروج و کمال کے مقبرے اور مدفن بنتی ہیں اور ایک دن زاغ و زغن ان میں اپنے آشیانے بناتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کو یاد دلایا کہ لوگو، خدا کی شانوں اور اس کی عظیم قدرتوں کو یاد کرو اور خدا کی زمین میں مفسد بن کر سر نہ اٹھاؤ۔ فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ۔ 'مُسْتَضْعَف' کے معنی ہیں زیردست، دبائے ہوئے، بے اثر، مظلوم۔ انبیاء کی دعوت قبول کرنے میں ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں ہی نے سبقت کی ہے اس لیے کہ وہ استکبار کے حجاب سے پاک ہوتے ہیں اور استکبار ہی وہ چیز ہے جو قبولِ حق میں سب سے بڑا مانع ہے۔ ابلیس کی سرگزشت میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ'۔ اہل ایمان سے متکبرین کا یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ اس شخص کو خدا کا رسول سمجھ بیٹھے ہو تو بڑے ہی کم عقل اور بدھو ہو۔ اہل ایمان کا جواب کہ "ہم تو اس پیغام پر ایمان رکھتے ہیں جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں" سوال کے اصل جواب سے ایک قدم آگے ہے۔ انھوں نے حضرت صالحؑ کی صرف رسالت کے اقرار ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی اصل دعوت کی صحت و صداقت پر اپنے کامل ایمان اور اس ایمان پر اپنے پختہ عزم و حزم کا اظہار بھی کیا۔ ظاہر ہے کہ متکبرین کو اصل چڑ حضرت صالحؑ سے نہیں بلکہ ان کی دعوت اور ان کے پیغام ہی سے تھی۔ چنانچہ اہلِ ایمان نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر ان کے اندر کے چھپے ہوئے اس خناس ہی پر ضرب لگائی اور یہ گویا اینٹ کے جواب میں پتھر تھا جس نے ثابت کر دیا کہ اب تک جو لوگ دبلے ہوئے یا دبائے ہوئے تھے اب وہ اس حق کے معاملے میں کسی سے دبنے والے نہیں۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ رسولوں پر ایمان لانے والے اگرچہ ابتداءً غریب اور کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں لیکن جو چیز ان کو اپیل کرتی ہے وہ نبی کی دعوت کی قوت و حجت ہوتی ہے نہ کہ معجزے اور کرشمے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنی بڑائی اور ذہانت و فطانت کے مدعی ہوتے ہیں وہ آخر تک نشانیوں اور معجزوں ہی کے چکر میں پھنسے رہ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب اللہ کا عذاب ان کی کمر توڑ دیتا ہے۔

'قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا الاية' یہ متکبرین کی طرف سے آخری جھنجلاہٹ کا اظہار ہے کہ تم نے صالح کو مان لیا ہے تو مانو ہم تو اس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں، ہم اس کا صاف انکار کرتے ہیں۔

'فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ' 'عَقَر' کے معنی اونٹ یا اونٹنی کی کونچیں کاٹ دینے کے ہیں۔ 'عتو' کا صلہ جب 'عن' کے ساتھ آئے تو یہ سرکشی

اور نافرمانی دونوں کے مفہوم پر متضمن ہوتا ہے۔ یہ قوم کے متمردین کی طرف سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالحؑ کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تم نے دھمکی دی تھی کہ ہم نے اس کو گزند پہنچایا تو ہم پر عذاب آجائے گا تو اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو عذاب لاؤ۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ یہ قوم کی طرف سے حضرت صالحؑ کی تکذیب کا گویا آخری اور حتمی عملی اعلان تھا۔ اس کے بعد اگر ان کو مزید مہلت ملتی تو اب ان کا حملہ حضرت صالحؑ ہی پر ہوتا اس وجہ سے تیسرے دن ان پر عذاب آگیا۔ اونٹنی کو ہلاک کرنے کا جرم اگرچہ، جیسا کہ سورۂ شمس میں تصریح ہے، ثمود کے سرکش لیڈر نے کیا تھا لیکن تمام متمردین اس کے اس فعل پر راضی رہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب سب ہی کی طرف کیا۔

قوم ثمود کے عذاب کی نوعیت

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۔ 'رَجْفَةٌ' کے معنی شدت کی حرکت، کپکپی، اور تھرتھراہٹ کے ہیں۔ یہ اس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم ثمود پر آیا۔ قرآن نے اس عذاب کو دوسری جگہ 'صَیْحَةٌ' سے بھی تعبیر کیا ہے جس کے معنی ڈانٹ کے ہیں، بعض جگہ 'صَاعِقَةٌ' سے بھی تعبیر کیا ہے (مثل صاعقة عاد وثمود) جس کے معنی کڑکے کے ہیں، سورۂ حاقہ میں 'طَاغِیَةٌ' سے تعبیر کیا ہے (فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِیَةِ) جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی کے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں عاد و ثمود دونوں قوموں کے عذاب کی نوعیت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ آخر میں خلاصۂ بحث ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

"اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرمائی بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب بھیجا۔ چونکہ اصل تباہی زیادہ تر ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے موثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے سرما کے دھاڑیوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہری کر دینے چیخ بھی چھپی ہوئی تھی جس طرح کہ قوم عاد پر رعد و برق والے بادل بھیجے۔"

بہرحال 'رَجْفَة' کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ زلزلہ کا عذاب تھا۔ 'رجفۃ' مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے شمال کی باد تند، جس کو صرصر کہتے ہیں، چلی اور وہ اتنی سخت و شدید ہوگئی کہ اس نے ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیا۔ کڑکے کی شدت ایسی بے پناہ ہوئی کہ لوگ اوندھے منہ زمین پر پڑے رہے اور اسی حال میں ہلاک ہو گئے۔

'دَار' کا لفظ یہاں 'دیار' کے معنی میں ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود آیت ۶۵ میں لفظ 'دار' استعمال ہوا، پھر انہی ثمود کے ذکر میں آیت ۶۷ میں 'دیار' استعمال ہوا۔ یہ قرآن نے گویا خود لفظ کی تفسیر کر دی۔

فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۔

یہ قوم سے حضرت صالحؑ کا آخری خطاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انھوں نے عذاب آنے سے پہلے اس وقت فرمایا ہے جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر عذاب کے بند کو گویا توڑ دیا ہے۔ یہی وداعی فقرہ کہہ کر

انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت فرمائی ہوگی۔ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے، اللہ کے حکم سے، وہ علاقۂ عذاب سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ اونٹنی کے قتل کے بعد صرف تین دن کی قوم کو مہلت ملی۔ اس تین دن کی مہلت میں جہاں بعض دوسری مصلحتیں تھیں وہاں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ اس اثنا میں حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھی علاقہ سے اتنے دور نکل جائیں کہ عذاب کا کوئی جھونکا ان کو نہ چھو سکے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب بیان میں اس بات کو عذاب کے ذکر کے بعد کیوں کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتلِ ناقہ کے ساتھ متصل کر دیا اور حضرت صالحؑ کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کر دیا۔ گویا جوں ہی انھوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا عذاب آدھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہو سکتی اگر اس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آجاتی۔ قرآن میں اس اسلوب مبادرت کی مثالیں بہت ہیں۔ آگے قوم شعیبؑ کی سرگزشت میں بھی اس کی مثال ہے۔ سورۂ ہود میں، حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیات ۴۲، ۴۵ ملاحظہ ہوں، نہایت واضح اور بلیغ مثال اس اسلوب کی موجود ہے۔

'یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ الایۃ' سے ایک حقیقت یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ان انبیاء کے خطاب میں 'یاقوم یاقوم' کا لفظ جو بار بار آتا ہے یہ محض دلداری اور استمالت کی نوع کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ جس طرح ہر شخص پر اس کے اپنے وجود، اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان کا ایک حق ہوتا ہے اسی طرح اپنی قوم اور اپنے وطن کا بھی اس پر ایک حق ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پورے اخلاص، پوری دل سوزی اور پوری جاں بازی کے ساتھ اس کی خیر خواہی کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اپنی قوم کے حق سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ جو شخص یہ حق ادا کر چکتا ہے وہ اللہ کے نزدیک سرخ رو ہے، اس سے اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہوگی کہ قوم تباہی کی راہ پر کیوں گئی، ہدایت کی راہ پر کیوں نہ چلی؟ لیکن جنھوں نے یہ حق ادا نہیں کیا ہے وہ اس حق کے باب میں عنداللہ لازماً مسئول ہوں گے۔

'وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ' محض اظہارِ حسرت کا کلمہ نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ قوم کے قومی مزاج کے بگاڑ کا ایک درجہ و مرحلہ وہ بھی ہوتا ہے جب تمام پیمانے اس طرح تلپٹ اور تمام اقدار اس درجہ متغیر ہو جاتے ہیں کہ خیر خواہی کا کلمہ کہنا جان جوکھوں کا کام بن جاتا ہے۔ جو لوگ عذاب الٰہی کے بند کو توڑتے ہیں وہ قوم کے لیڈر اور ہیرو بن جاتے ہیں اور جو اس عذاب سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بدخواہ، غدار اور قوم کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ قومی فساد مزاج کی یہی وہ حد ہے جہاں پہنچ کر لازماً قوم تباہی سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ جب کسی مریض کا یہ حال ہو جائے کہ اسے معالجوں اور طبیبوں سے دشمنی ہو جائے اور صرف انھی کے مشورے اسے پسند آئیں جو اس کے مرض میں اضافہ کے خواہشمند ہوں تو موت کے سوا

اب اس کے لیے اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے۔

قوم لوط اور حضرت لوطؑ کی سرگزشت

'وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ'۔ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے ہیں۔ یہ جس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے وہ شام کے جنوبی علاقہ میں دریائے اردن کے اردگرد آباد تھی۔ ان کے ذکر میں اسلوبِ بیان اس سے ذرا مختلف ہے جو حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذکر میں ہے۔ ان دونوں حضرات کو تو 'اَخَاھُمْ ھُوْدًا' اور 'اَخَاھُمْ صٰلِحًا' کے الفاظ سے ان کی قوموں کی طرف منسوب فرمایا لیکن حضرت لوطؑ کی قوم کو ان کی قوم تو کہا لیکن ان کو ان کے بھائی کی حیثیت سے ان کی طرف منسوب نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کے اعتبار سے تو یہ لوگ ان کی قوم تھے لیکن باعتبارِ نسب اور قبیلہ حضرت لوطؑ ان سے الگ تھے۔ قرآن نے اس معمولی فرق کو بھی اپنے اسلوب بیان سے واضح فرما دیا۔ رسولوں کے باب میں عام سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ اسی قوم کے اندر سے ہوتے ہیں جس کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قوم ان کے ماضی و حاضر، ان کے اخلاق و کردار اور ان کی زبان سے اچھی طرح آشنا ہو تاکہ اجنبیت و غیریت موجبِ وحشت نہ بنے۔ یہ چیز جس طرح نسبی تعلق سے حاصل ہوسکتی ہے اسی طرح کسی قوم کے اندر طویل قیام سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ حضرت لوطؑ چونکہ اسی قوم کے اندر رہ بس گئے تھے بلکہ قرینہ شاہد ہے کہ انھوں نے انہی کے اندر شادی بھی کرلی تھی اس وجہ سے وہ قوم کے لیے بمنزلہ ایک فردِ قوم کے تھے۔ ان کی تربیت، جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے فرمائی تھی۔ ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ یہ بعینہٖ وہی صورتِ حال ہے جو حضرت موسیٰؑ کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں۔ باوجودیکہ حضرت موسیٰؑ قومِ فرعون کے اندر سے نہیں تھے لیکن ایک طویل مدت تک ان کے اندر رہے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو قومِ فرعون کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

'اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمْ بِھَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ'۔ 'اَلْفَاحِشَۃَ' کھلی ہوئی بدکاری و بے حیائی کو کہتے ہیں اور استفہام یہاں اظہارِ نفرت و کراہت کے مفہوم میں ہے۔ اس 'فَاحِشَۃَ' کا یہاں نام نہیں لیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بے حیائی دفت کی سوسائٹی میں اس درجہ عام تھی کہ نام لیے بغیر بھی ہر شخص سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔

'مَا سَبَقَکُمْ بِھَا' 'فَاحِشَۃَ' کی صفت نہیں ہے۔ اگر یہ صفت ہوتا تو معروف قاعدہ زبان کے مطابق 'فَاحِشَۃً' کو نکرہ ہونا تھا۔ میرے نزدیک یہ الگ جملہ ہے۔ حضرت لوطؑ نے یہاں درحقیقت دو مختلف پہلوؤں سے اس برائی پر اظہارِ نفرت فرمایا ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ ایسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو، جس کا بے حیائی ہونا ہر عقلِ سلیم پر واضح ہے! پھر فرمایا کہ یہ حرکت شنیع تو تم سے پہلے کسی قوم نے نہیں کی۔

'مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ' سے یہ بات لازم نہیں آتی ہے کہ قومِ لوطؑ سے پہلے یہ حرکتِ شنیع کسی ایک فرد سے بھی صادر نہ ہوئی ہو۔ ہم دوسری جگہ واضح کرچکے ہیں کہ لفظ 'اَحَد' جمع کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ مثلاً 'لَا

نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ، يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ اس وجہ سے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے کوئی شامت زدہ سوسائٹی ایسی نہیں گزری جس نے اس غلاظت کو تمھاری طرح اوڑھنا بچھونا بنایا ہو۔

عمل قوم لوط کی سنگینی

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اوپر جن رسولوں کی دعوت کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ہر ایک کی دعوت کا آغاز توحید سے ہوا ہے لیکن حضرت لوطؑ نے توحید کی دعوت سے آغاز کرنے کے بجائے سب سے پہلے قوم کی اس بے حیائی کو موضوع بحث بنایا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی قوم کے اندر شرک کی برائی موجود نہیں تھی ؟ اگر موجود تھی تو حضرت لوطؑ نے اس کو کیوں نظر انداز فرمایا ؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ برائی اور برائی میں فرق ہوتا ہے۔ ایک برائی تو وہ ہوتی ہے، جو خواہ کتنی ہی سنگین ہو، لیکن وہ انسانی عوارض میں سے ہے اور انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے، دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی کے اندر فیشن کی حیثیت سے اس کا پایا جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اس انسان یا اس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہو گئی ہو۔ جہاں اس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابل توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے، دوسری باتیں خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں، سب ثانوی درجے میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو آپ اس کو ایمان واسلام کی تلقین کریں گے یا سب سے پہلے اس کی یہ عبرت انگیز حالت آپ کو متوجہ کرے گی ؟ حضرت لوطؑ کو اسی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ ان کی قوم کے اندر شرک و کفر کی برائی بھی موجود تھی، اور دوسری تمام برائیاں بھی، جو شرک و کفر کے لوازم میں سے ہیں، موجود تھیں لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہو گئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بناتے رہے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی، ان سے کوئی دوسری بات کرنے کا مرحلہ تو بہر حال اس کے بعد ہی آسکتا تھا۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ قرآن کی نگاہ میں عمل قوم لوط کی سنگینی کا کیا حال ہے اور پھر ذرا یاد کیجیے اس واقعہ کو کہ برطانوی پارلیمنٹ نے پچھلے دنوں اپنے ایک قانون کے ذریعہ سے اپنی قوم کے لیے اس ملعون فعل کو بالکل مباح کر دیا ہے۔ اللہ کے حلم کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ مہلت دیتا ہے تو بڑی طویل مہلت دیتا ہے لیکن برطانوی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کر کے خدا کے عذاب کے لیے اپنے دروازے چوپٹ کھول دیے ہیں۔ اب دیکھیے یہ مدت مہلت کتنی دراز ہوتی ہے۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ یہ اظہار نفرت کا تیسرا پہلو ہے۔ یعنی تم نے تو فطرت کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیا ہے۔ جملہ میں جو تاکید ہے وہ نفرت اور تعجب کی شدت کو ظاہر کر رہی ہے۔ 'رِجَال' کا لفظ بھی یہاں معنی خیز ہے اس لیے کہ 'رِجَال' پختہ سن و سال

کے مردوں کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے ایک تو اس فعل کے گھنونے پن کا اظہار ہو رہا ہے۔ دوسرا اس سے اس دیوثیت کا اظہار ہو رہا ہے جو کسی قوم میں اس مرض خبیث کے عام ہو جانے کی صورت میں لازماً پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے عام ہو جانے کی صورت میں سن و سال کی تمیز بالکل اٹھ جاتی ہے۔ پھر ہر عمر کے دیوث قوم میں پھیل جاتے ہیں اور ان کے لیے یہ لعنت عادت اور پیشہ بن جاتی ہے۔ 'مِنْ دُوْنِ النِّسَآءِ' کے الفاظ اس قلب ماہیت کو ظاہر کر رہے ہیں جو اس فساد طبیعت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ساری تخلیقی قوت بالکل غلط ہدف پر برباد ہوتی ہے۔ بنجر سیراب ہوتے ہیں، کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں جس کا انجام حرث و نسل کی تباہی اور آخرت کی روسیاہی ہے۔ 'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ' فطرت سے بغاوت کی تعبیر ہے اور فطرت سے بغاوت کا انجام ظاہر ہے۔

'وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' اسلوب بیان سے واضح ہے کہ حضرت لوطؑ کا ایک ایک فقرہ آنکھیں کھول دینے والا اور فطرت کو جھنجھوڑ دینے والا تھا لیکن جن کی مت ماری گئی ہو اور جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہو ان پر یہ وعظ کیا کارگر ہو سکتا تھا! وہ یہ سب سن کر بولے تو یہ بولے کہ ان کو بستی سے نکالو، یہ بڑے پارسا بنتے ہیں! یہ کسی معاشرے کے بگاڑ کی آخری حد ہے۔ معاشرہ بگڑتے بگڑتے اس حد تک بگڑ جاتا ہے کہ ایک وقت آتا ہے جب سب اپنی ناک کٹوا بیٹھتے ہیں اور نکٹا ہونا ہی تہذیب اور فیشن کا تقاضا بن جاتا ہے۔ اس وقت چہرے پر ناک کا نہ ہونا عیب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کا ہونا ایک اعجوبہ گنا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو، اگر ظالموں کا بس چلتا ہے تو نکو بنا کر برادری سے باہر کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ 'يَتَطَهَّرُوْنَ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گندگی میں آلودہ اور حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو پاکیزہ سمجھتے تھے لیکن ان کی یہ پاکیزگی پسندیدہ ہونے کے بجائے ان کے دل پر شاق تھی کہ آخر یہ کیوں بچے پھرتے ہیں۔ ہم جس چہ بچہ میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں، یہ کیوں نہیں اس میں اُترتے ہ

'فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ': اوپر 'اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تھے جو حضرت لوطؑ پر ایمان لائے تھے لیکن اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہل و عیال کے سوا کوئی اور ان پر ایمان لانے والا نہ تھا۔ اگر کچھ لوگ ایمان لائے ہوتے تو نجات پانے والوں میں ان کا ذکر بھی ہوتا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ایک قلیل گروہ، جیسا کہ لفظ 'اُنَاسٌ' سے ظاہر ہوتا ہے، ان پر ایمان تو لایا لیکن یہ لوگ سب ان کے متعلقین ہی میں سے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو لفظ 'اھل' ہی سے تعبیر فرمایا۔

اس 'اھل' میں سے بھی حضرت لوطؑ کی بیوی خارج ہو گئی۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ اس کی طبیعت کا فساد ہوا۔ اس فساد طبیعت کو اس بات سے بھی تقویت ملی ہوگی کہ اس کا تعلق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا،

اسی ناہنجار قوم سے تھا۔ خاندان اور قوم کی عصبیت اکثر حق کی راہ میں رکاوٹ بنی ہے۔ اس زنجیر کو توڑنے میں صرف وہی لوگ کامیاب ہوئے ہیں جن کے اندر خدا کی لگن اتنی شدید ہوئی کہ وہ ہر مخالف جذبہ پر غالب آ گئی۔ قرآن نے اس صورت کا ذکر خاص طور پر اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے فرمایا کہ نجات کی راہ صرف ان کے لیے کھلتی ہے جو خود اس کے طالب ہوں اور دوسری چاہتوں کو جو اس میں روک بنیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر یہ عشقِ حق اور اس کے لیے قربانی کا یہ جذبہ کسی میں نہ ہو تو ایک پیغمبر کی بیوی، ایک پیغمبر کا بیٹا، ایک پیغمبر کا باپ یا چچا ہونا بھی آدمی کے لیے ذرا نافع نہیں ہوتا۔ حضرت لوطؑ کی بیوی، حضرت نوحؑ کے بیٹے، حضرت ابراہیمؑ کے باپ اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا انجام اس حقیقت کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔

قومِ لوط کا عذاب

'وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا' الایۃ یہاں بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں ہے بلکہ کنکروں اور پتھروں کی بارش ہے۔ قومِ لوط پر اس طوفانی ہوا کا عذاب آیا تھا جو صحراؤں سے اٹھتی ہے اور قافلے کے قافلے اور بستیوں کی بستیاں جس کی اٹھائی ہوئی ریت اور جس کے برسائے ہوئے کنکروں اور پتھروں کے نیچے دب کر فنا ہو جاتی ہیں۔ عربی میں اس کو حاصب یعنی کنکر پتھر برسانے والی آندھی کہتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس عذاب کی نوعیت یہ بیان فرمائی ہے۔

"قومِ لوط پر اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر پتھر برسانے والی آندھی) بن گئی۔ اس سے اوّل اوّل تو ان کے اوپر کنکوں اور پتھروں کی بارش ہوئی، پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ چنانچہ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے 'فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا' - ۴۰ عنکبوت (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا ہے 'فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ' ۸۲ - حجر (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند آندھی چلی کہ ان کے مکانات زمین کے برابر ہو گئے اور اوپر سے کنکر اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا۔ جیسا کہ فرمایا ہے 'وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى' - ۵۳ نجم (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا اور پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز سے ڈھانک دیا)"

آگے مولاناؒ نے تورات کے ترجموں پر تنقید کر کے یہ واضح فرمایا ہے کہ ترجمہ میں غلطی کر کے کس طرح انھوں نے صورتِ واقعہ کچھ سے کچھ بنا دی۔ پھر خلاصۂ بحث ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں۔

"اس سے معلوم ہوا کہ قومِ لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگ ریزے برسانے والی آندھی کا عذاب بھیجا۔ جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا اور اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو اس پر اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ ان پر بجلی اور کڑکے کا عذاب بھی آیا۔"

اہلِ مدین اور حضرت شعیبؑ کی سرگزشت

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا، قوم مدین کا مسکن بحر احمر کے ساحل پر کوہ طور کے جنوب و مشرق میں تھا۔ ان کے پیغمبر حضرت شعیبؑ ہوئے۔ یہ وہی حضرت شعیبؑ ہیں جنھوں نے اپنی ایک صاحب زادی کا نکاح حضرت موسیٰ کے ساتھ کیا تھا اور حضرت موسیٰ نے ایک طویل عرصہ تک ان کے پاس قیام کیا اور ان کی بکریاں چرائیں۔ یہ پوری سرگزشت سورۂ قصص میں بیان ہوئی ہے اور اللہ کے پاکیزہ خصائل بندوں کی نہایت پاکیزہ اور موثر سرگزشت ہے۔

مدین کے لوگ چونکہ ایک اہم تجارتی گزرگاہ پر تھے اس وجہ سے انھوں نے تجارت میں بہت ترقی کی اور پھر ان کے اندر عقائدی خرابیوں کے ساتھ ساتھ وہ برائیاں بھی پیدا ہوگئیں جو تجارت پیشہ قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ آگے حضرت شعیبؑ کی دعوت میں ان لوگوں کی ان برائیوں کا ذکر ہے۔

قَالَ يَٰقَوْمِ ... قَدْ جَآءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ، یہاں جس بَيِّنَةٌ کا ذکر ہے اس کی کوئی تفصیل قرآن یا تورات میں مذکور نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد کوئی حسی معجزہ ہو جو عام سنت الٰہی کے مطابق، دوسرے رسولوں کی طرح ان کو بھی عطا ہوا لیکن قرآن نے اس کی طرف صرف اشارہ کر دیا، اس کی نوعیت واضح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد خود ان کی اپنی ذات اور اپنی دعوت ہو اس لیے کہ رسول خود اپنی ذات میں ایک کامل بینہ اور کامل حجت ہوتا ہے۔ وہ ہر پہلو سے حق کو اس طرح واضح اور مبرہن کر دیتا ہے کہ ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے سوا کسی کے لیے بھی اس سے اعراض کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ معجزہ نبوت کے شرائط میں سے نہیں بلکہ ضروریات اور توابع میں سے ہے۔ کوئی قوم اگر مطالبہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے، اتمام حجت کے طور پر، نبی کے ذریعہ سے معجزہ بھی صادر کرا دیتا ہے۔ نبی کی اصل دعوت ان بینات پر مبنی ہوتی ہے جو عقل و فطرت کے اندر ودیعت ہیں اور اس کی زندگی ان بینات کا مظہر کامل ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم کے اندر خدا کا ایک چلتا پھرتا نور ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ، اس کا ہر اشارہ اور اس کا ہر عمل اس کی صداقت، اس کی حکمت اور اس کے سفیر الٰہی ہونے کی ایسی گواہی ہوتا ہے کہ اس کی تکذیب صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے دل کی گواہی کے خلاف اس کی تکذیب کرنا چاہتے ہیں۔

معاملات میں دیانت اور راست بازی

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَٰحِهَا،

تجارتی کاروبار اور لین دین میں چونکہ اشیا عام طور پر ناپی یا تولی جاتی ہیں اس غالب پہلو کے سبب سے ناپ تول ہی کا ذکر ہوا۔ اصل مقصود معاملات میں دیانت اور راست بازی کی تعلیم ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنا کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ کسی قوم کے اندر بہت سی برائیوں کے جمع ہو جانے کی علامت ہے۔ یہ درحقیقت عدل و قسط کے تصور کے مختل ہو جانے اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے عقیدے کے مردہ ہو جانے کی نشانی ہے جس کا فساد لازماً زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کرتا ہے لیکن سرطانی پھوڑے کی طرح اس کا ظہور کسی کے اندر کسی پہلو سے ہوتا ہے، دوسرے کے اندر کسی اور پہلو سے۔ مدین کے لوگ چونکہ

تجارت پیشہ تھے اس وجہ سے ان کے اندر یہ ناپ تول کی خیانت کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن تھا یہ ان کے پورے نظامِ تمدن و معاشرت میں سرایت کیے ہوئے اس وجہ سے قرآن نے ایفائے کیل و میزان کی تاکید کے ساتھ منفی پہلو سے بھی واضح فرما دیا کہ ملک میں فساد نہ مچاؤ یعنی یہ ناپ تول کی کمی ملک کے پورے نظامِ معاشرت و معیشت کے درہم برہم کر دینے کے ہم معنی ہے۔ اگر تمھاری یہ روش نہ بدلی تو بالآخر تمدن کی عمارت کی کوئی اینٹ بھی اپنے مقام پر قائم نہ رہ سکے گی اس لیے کہ خدا نے آسمان و زمین کو ایک میزان پر قائم کیا ہے۔ اگر یہ میزان ایک پل کے لیے بھی مختل ہو جائے تو آسمان و زمین درہم برہم ہو جائیں۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بندے اپنے دائرۂ اختیار میں بھی ملک کے نظام کو اسی وقت تک قائم رکھ سکیں گے جب تک وزن و قسط کو قائم رکھیں گے، اگر وزن و قسط کو انھوں نے درہم برہم کیا تو پھر پورے نظام کی ایک ایک چول ہل جائے گی۔ سورۂ رحمان میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: 'وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ'۔ (وہ رحمان) اور آسمان کو بلند کیا اور اس میں ایک میزان رکھی، کہ تم بھی میزان میں حدود سے نہ ہٹو اور وزن بالکل ٹھیک ٹھیک قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو)

تمدن کے فساد کا ایک سبب

'بَعْدَ إِصْلَاحِهَا' کی قید کے اندر جو زور ہے اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ یہاں اوپر کی ساری تقریر کے بعد اس کا مفہوم مزید واضح ہو گیا ہے۔ اوپر آپ نے دیکھا کہ قوموں نے اپنی سرکشی کے سبب سے بار بار نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کیا ہے اور قدرت کے ہاتھوں نے ہر بار اس کو درست کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کی سرگزشت سے لے کر حضرت شعیبؑ کی سرگزشت تک ہر قوم اور ہر رسول کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔ اہلِ مدین کو بھی جو اقتدار حاصل ہوا تھا ایک فاسد اقتدار کو مٹا کر حاصل ہوا تھا۔ یہ لوگ دین و شریعت سے ناآشنا لوگ نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے نسبت رکھنے والے اور پچھلے نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی تھے لیکن دوسری قوموں کی طرح انھوں نے بھی اس تعلیم کو اپنی خواہشاتِ نفس کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضرت شعیبؑ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ 'ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ' اگر تمھیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس دعوے کی صداقت کے لیے ضروری ہے کہ اس فساد کی روش کو چھوڑ کر اصلاح کی وہ روش اختیار کرو جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ یہی روش اس ایمان کا مقتضی ہے جس کے تم مدعی ہو۔

'وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا'۔ یہ قوم کے سرکشوں کی ان سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ حضرت شعیبؑ کے ساتھیوں کو ہراساں اور خوف زدہ کرنے اور ایمان کی راہ سے ہٹانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے جگہ جگہ ہر نکڑ پر گنڈے سرِ راہ بیٹھ جاتے اور جہاں کوئی مسلمان مل جاتا اس کے درپے آزار ہو جاتے۔ اس کو ڈراتے دھمکاتے کہ وہ حضرت شعیبؑ

کا ساتھ اور ایمان کی راہ چھوڑ کر پھر ان کے طریقہ پر آ جائے۔ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کی وضاحت ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں۔ خدا تک پہنچنے کی راہ توحید ہے۔ اس راہ میں کجی کرنے کے معنی اس کو شرک کی پگڈنڈیوں کی طرف موڑنے اور لوگوں کو توحید سے ہٹا کر گمراہی کے راستوں پر ڈالنے کے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ، پہلے جملے میں شکر کی دعوت اور دوسرے جملے میں کفرانِ نعمت کے انجام کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم چھوٹے سے خاندان کی شکل میں اس علاقے میں آ کر بسے تھے، پھر خدا نے تم کو ایک طاقتور قوم بنا دیا۔ تمھاری تعداد کی کثرت کے ساتھ ساتھ تمھارے اسبابِ معیشت و تمدن میں بھی اضافہ ہوا یہاں تک کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے تم اس درجے کو پہنچے جو آج تمھیں حاصل ہے۔ یہ سب اللہ کی دین ہے اور اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ خدا کے شکر گزار بنو اور زندگی کی وہ روش اختیار کرو جو خدا کو پسند ہے۔ لیکن تم نے اس کے برخلاف کفرانِ نعمت اور سرکشی کی راہ اختیار کی اور خدا کی زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مچا رہے ہو تو مفسدین کے انجام کو نہ بھولو۔ تمھارے دائیں بائیں ثمود اور قوم لوط کے آثار تباہی موجود ہیں۔ ان کے انجام سے سبق حاصل کرو۔

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ، اوپر مفسدین کے جس انجام سے ڈرایا ہے یہ اسی سے متعلق ایک شبہ کا ازالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کا یہ انجام تو قطعی اور یقینی ہے۔ تمھیں جو مہلت مل رہی ہے اس سے یہ نہ سمجھو کہ میری بات جھوٹی ہے خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ خدا نے اب تک جو تمھیں مہلت دے رکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے ایک گروہ میری بات پر ایمان لایا ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم میں سے اور بھی جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے وہ چھٹ کر علیحدہ ہو جائیں۔ پس ان کی خاطر تمھیں یہ مہلت مل رہی ہے۔ اس مہلت تک انتظار کرو۔ اس کے بعد خدا ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ فرما دے گا اور وہ بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

مفسدین کی مہلت کا قانون

یہ حضرت شعیبؑ نے ایک سنت الٰہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ قوم کی غالب اکثریت رسول کی دعوت کا انکار کر دیتی ہے اور اس انکار پر اڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات جلد واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ قوم ایمان کی صلاحیت سے بالکل خالی ہے۔ پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس پر عذاب بھی جلد آ جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم کے اندر سے ایک گروہ ایمان لاتا ہے، دوسرا گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ صورت اس بات کا قرینہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر کچھ صلاحیت موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو مزید بلویا جائے تو اس کے اندر سے کچھ مزید مکھن نکلے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان اور قہر کرنے میں بہت دھیما ہے اس وجہ سے وہ ایسی صورت میں قوم کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ نبی اور صالحین اپنی پوری قوم کو اپنے چھاج میں اچھی طرح پھٹک لیتے ہیں۔ اس عمل کے پورے ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس قوم کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا

ہے کہ قوم کو یہ مہلت ان صالحین کی برکت سے ملتی ہے جو اس کے اندر سے رسول کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ 'فَاصْبِرُوْا' یہاں انتظار کے معنی میں ہے اور 'خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہر حال اس کا فیصلہ بالکل حق و عدل پر مبنی ہوگا اور ٹھیک اس وقت ہوگا جب کہ اس کو ہونا چاہیے۔

'قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ الاٰيه' یہ قوم کے متکبرین کی طرف سے حضرت شعیبؑ اور ان کے ساتھیوں کو آخری دھمکی ہے کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال چھوڑیں گے۔ اس پر حضرت شعیبؑ نے فرمایا 'اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ' یعنی کیا تم اپنی ملت میں لوٹنے پر ہماری خواہش اور ارادہ کے علی الرغم ہمیں مجبور کرو گے؟ حضرت شعیبؑ کے اس ارشاد سے یہ بات صاف نمایاں ہے کہ انھوں نے وطن سے نکالے جانے کی دھمکی کو تو یک قلم نظر انداز کر دیا لیکن ان کی دوسری دھمکی کا نوٹس لیا اور اس کا جواب بڑے واضح اور قطعی لفظوں میں دیا جس کی تفصیل آگے والی آیت میں ہے۔

'قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا' یہ بڑا ہی فیصلہ کن جواب ہے۔ اس میں ایمان پر غیر متزلزل عزم کا اظہار بھی ہے اور ملتِ کفر سے انتہائی بیزاری کا اعلان بھی۔ حضرت شعیبؑ نے اول تو اس ملت کو افترا علی اللہ قرار دیا گویا سراسر جھوٹ کا مجموعہ جس کو بالکل بے سند خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ دوسرے فرمایا کہ جب اللہ نے اپنے فضل و رحمت سے اس لعنت سے ہمیں نجات دی تو ہمارے لیے اس میں دوبارہ مبتلا ہونے کا کیا سوال ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ جواب حضرت شعیبؑ اپنے ان ساتھیوں کی طرف سے بھی دے رہے ہیں جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے سے پہلے قوم کی عام گمراہی میں مبتلا رہ چکے تھے اس وجہ سے انھوں نے "بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی" کے الفاظ فرمائے ورنہ جہاں تک حضرات انبیاء کا تعلق ہے وہ بعثت سے پہلے بھی ہدایت فطرت پر ہوتے ہیں۔ ان کا دامن شرک سے کبھی آلودہ نہیں ہوتا۔

تفویض الی اللہ توحید کی حقیقت ہے

'وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا'۔ اس فقرے کے پہلے ٹکڑے میں اپنے عزم کا اظہار اور دوسرے میں تفویض الی اللہ ہے۔ اور یہی عزم اور تفویض توحید کی حقیقت ہے۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ صاف سن لو کہ اب تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن اللہ کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔ اس کی آزمائشوں میں کامیاب اترنا اسی کی بخشی ہوئی توفیق پر منحصر ہے۔ یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کے لیے کیا مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے (وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا) بس ہمارا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہے۔ اسی نے ہماری اس راہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اور اسی سے یہ امید ہے کہ وہ ہمیں ٹھکانے لگائے گا (عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا) پس ہماری اسی سے یہ دعا ہے کہ اے ہمارے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ۔ بعینہٖ یہی بات سیدنا ابراہیمؑ نے فرمائی تھی جو سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا، وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۸۰ (کیا تم اللہ کے بارے

میں مجھ سے جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ اس نے مجھے ہدایت بخشی، اور میں ان چیزوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی بات چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے)

'وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّکُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ' حضرت شعیبؑ کے مذکورہ بالا فیصلہ کن جواب کے بعد اب ان سے تو ان متمردین کے لیے کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن چلتے چلاتے انھوں نے ایک آخری دھمکی ان غریب مسلمانوں کو اور سنا دی جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے تھے کہ اگر تم لوگوں نے اس شخص کا ساتھ نہ چھوڑا تو یاد رکھو کہ بڑے ہی خسارے میں رہو گے۔ اس خسارے کی انھوں نے کوئی وضاحت نہیں کی اس لیے کہ اس کے ابہام میں ہی سب کچھ چھپا ہوا ہے اور اس لفظ کے استعمال میں ہمدردی کی نمائش بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو نیک و بد تمھیں سمجھا دیا ہے لیکن اپنی بہبود کی یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو اس کے نتائج خود بھگتو گے۔

قوم شعیب کا عذاب

'فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ'۔ بعینہٖ یہی آیت اوپر قوم صالحؑ کی سرگزشت میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس عذاب کی نوعیت کیا تھی تو اس سوال کی وضاحت اس لفظ سے نہیں ہوتی۔ اس عذاب کی تعبیر سورۂ ہود آیت ۹۴ میں لفظ 'صَیْحَة' سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ اور کڑک کے ہیں۔ پھر اسی کی تعبیر سورۂ شعراء آیت ۱۸۹ میں 'عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ' سے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا دھوئیں کے ایک ستون یا پہاڑ کی شکل میں نظر آیا۔ یہ قرینہ، جیسا کہ ہم قوم لوط کی سرگزشت میں بیان کر چکے ہیں، 'حَاصِب' کے عذاب کا ہے۔ 'حَاصِب' کے عذاب میں 'رجفه' 'صیحة' اور ظله، سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ قرآن کے ایک اور مقام سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان پر قوم لوط ہی والا عذاب نازل ہوا تھا۔ سورۂ ہود میں حضرت شعیبؑ کی زبان سے قوم کو مخاطب کر کے یہ دھمکی نقل ہوئی ہے 'وَیٰقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْکُمْ بِبَعِیْدٍ ۸۹۔ هود (اے میرے ہم قومو، میری مخالفت تمھارے لیے کہیں اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اسی طرح کا عذاب آدھمکے جس طرح کا عذاب قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آیا اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں) اس آیت کے آخری فقرے پر غور کیجیے تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بھی اسی 'حَاصِب' کی زد میں آئے جس کی زد میں ان کی پیشرو پڑوسی قوم لوط کے لوگ آئے تھے۔

'اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۚ اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ'۔ یہ اس عذاب کا نتیجہ بیان ہوا ہے اور اس کے دونوں فقروں میں ان دونوں دھمکیوں کی طرف تلمیح ہے جو قوم شعیبؑ کے کفار نے حضرت شعیبؑ اور ان کے ساتھیوں کو دی تھیں۔ انھوں نے دھمکی دی تھی کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال کر چھوڑیں گے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خود اس دیار سے اس طرح مٹے ع گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔

انھوں نے حضرت شعیبؑ کے ساتھیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم اس شخص کی پیروی سے دست کش نہ ہوئے تو بڑے خسارے میں پڑو گے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارے میں پڑے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ۔ یہی آیت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اوپر قوم صالحؑ کی سرگزشت میں گزر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۷۹۔ وہاں ہم نے اس کے موقع و محل کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے یہ بات درحقیقت اس وقت فرمائی ہے جب انھوں نے خدا کی طرف سے حکم ہجرت مل جانے کے بعد اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی ہے لیکن عذاب کی مبادرت دکھانے کے لیے اس کا ذکر عذاب کے ذکر کے بعد ہوا۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں ایک سے ایک بڑھ کر لطیف موجود ہیں جو پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۔ یہ مجرد افسوس کی نفی نہیں بلکہ ہمدردانہ افسوس کی نفی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمھیں خدا کا پیغام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی میں اپنے دن رات ایک کر دیے۔ اس سب کے باوجود بھی اگر تم اپنا بیڑا غرق کرنے پر تلے بیٹھے ہو تو اب میرے لیے تمھارے اس انجام پر ترس کھانے کا کیا موقع باقی رہا!!

۱۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۹۴-۱۰۲

اوپر کی تمام سرگزشتیں سنانے سے مقصود قریش کو آگاہ کرنا تھا کہ جس کسوٹی پر یہ قومیں پرکھی گئیں وہی کسوٹی اب تمھارے سامنے ہے اور تم بھی، اگر تم نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی، وہی انجام دیکھو گے جو انھوں نے دیکھا اس وجہ سے آگے کی آیات میں وہ اصول و ضوابط بھی نگاہوں کے سامنے کر دیے ہیں جو مذکورہ بالا تاریخ سے سامنے آتے ہیں تاکہ قریش جو قدم بھی اٹھائیں نتائج سے اچھی طرح آگاہ ہو کر اٹھائیں۔

آیات ۹۴-۱۰۲

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِىٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ
حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا
عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۶﴾ أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا
وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿۹۷﴾ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا
ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ
ع إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۹۹﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ
بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ
قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ
أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۚ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا
بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۱﴾
وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ
لَفَاسِقِينَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمۂ آیات ۹۴-۱۰۲

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسول بھیجا، اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے ہیں۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا کوئی گمان نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔ ۹۴-۹۶

تو کیا بستیوں والے نچنت رہ سکے اس بات سے کہ آ دھمکے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اور وہ سوئے پڑے ہوں۔ اور کیا بستیوں والے نچنت رہ سکے اس

بات سے کہ ان پر آدھمکے ہمارا عذاب دن دہاڑے اور وہ کھیل کود میں ہوں۔ تو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بچ سکے۔ تو یاد رکھو کہ خدا کی تدبیر سے وہی لوگ نچنت ہوتے ہیں جو نامراد ہونے والے ہوں۔ کیا سبق نہیں ملا ان کو جو ملک کے وارث بنے ہیں اس کے اگلے باشندوں کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ابھی آپکڑیں اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیں تو وہ سننے سمجھنے سے رہ جائیں! یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان لانے والے نہ بنے بوجہ اس کے کہ وہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ ٹھپہ لگا دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔ اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کی استواری نہیں پائی۔ ان میں سے اکثر بدعہد ہی نکلے۔ ۹۷-۱۰۲

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَھْلَھَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّھُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ہ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الْحَسَنَۃَ حَتّٰی عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۹۴-۹۵)

'باْساء' اور 'ضرّاء' کا مفہوم

'باساء' اور 'ضراء' کی تحقیق ۴۲ انعام کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہ دونوں لفظ، جب ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال ہوتے ہیں تو پہلے سے مالی آفتیں مراد ہوتی ہیں۔ مثلاً قحط، گرانی، کساد بازاری وغیرہ اور دوسرے سے جسمانی آفتیں مثلاً بیماریاں اور وبائیں وغیرہ۔ لیکن جب 'ضرّا' کا لفظ 'سرّاء' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو یہ دونوں الفاظ ہر قسم کی بدحالی و خوش حالی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔

'عَفَا الشَّیْءُ' 'کَثُرَ وَطَالَ'۔ فلاں چیز خوب بڑھی، خوب اُگی۔ 'عفت الارض' 'غطاھا النبات'، زمین سبزہ اور نباتات سے ڈھک گئی۔

نبی کی منادی توبہ کی بازگشت آفاق میں

یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو انبیاء کی بعثت کے ساتھ لازماً ظاہر ہوتی ہے اور ان تمام انبیا کے زمانوں میں ظاہر ہوئی جن کی سرگزشتیں اوپر بیان ہوئیں۔ وہ سنت یہ ہے کہ جب نبی توبہ و استغفار اور جزا و سزا

کی منادی شروع کرتا ہے تو اس کے محرکات و مؤیدات اس کائنات میں بھی ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ایک طرف پیغمبر لوگوں کو غفلت و خدافراموشی کے انجام، فساد فی الارض کے نتائج اور دنیا اور آخرت میں خدا کی پکڑ سے ڈراتا ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ لوگوں کو سیلاب، قحط، وبا، طوفان کی آزمائشوں میں بھی مبتلا کرتا ہے تاکہ لوگ آنکھوں سے بھی، اگر ان کے پاس دیدۂ عبرت نگاہ ہو، دیکھیں کہ اس طرح اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے اور پھر خدا کے سوا کوئی ان کو بچانے والا نہیں بن سکتا۔ اس طرح گویا دعوت کے ساتھ واقعات کی تائید اور عقل و فطرت کی شہادت کے ساتھ مشاہدہ کی اثرانگیزی بھی جمع ہو جاتی ہے۔ نبی جو کچھ کہتا ہے، آسمان و زمین دونوں مل کر اپنے اسٹیج پر گویا اس کے مناظر دکھا بھی دیتے ہیں تاکہ جن کے اندر اثرپذیری کی کچھ بھی رمق ہو وہ خدا کے آگے جھکیں اور توبہ و اصلاح کریں۔

آزمائشوں کی ایک دوسری کروٹ

جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور اثر قبول کرنے والے دل ہوتے ہیں وہ ان آزمائشوں سے فائدہ اٹھاتے اور خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو گویا نبی کی دعوت کی بازگشت تمام عناصر کائنات سے سنائی دیتی ہے اور یہ صرف کانوں سے سنتے ہی نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھتے بھی ہیں لیکن جن کے دل پتھر اور کان بہرے ہو چکے ہیں ان کے لیے یہ سنتِ الٰہی ایک دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے۔ بدحالی کی جگہ خوش حالی آجاتی ہے، دنیوی اسباب و وسائل کے ہر گوشے میں ترقی و فراخی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، آزمائشوں اور تکلیفوں کے دن ذہنوں سے نکل جاتے ہیں۔ پھر سرکش لوگ چہکنا اور نبی اور اس کے ساتھیوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ عقل کے کوتاہ لوگ، پچھلے قحط یا گزشتہ سیلاب یا فلاں آفت کو ہمارے اعمال و عقاید کی خرابی پر خدا کی تنبیہ سمجھتے تھے اور اپنے وعظوں میں طرح طرح سے ہم کو ڈراتے اور لیپت ممبت کرتے رہے۔ حالانکہ ان باتوں کو ایمان و اخلاق سے کیا تعلق؟ اس قسم کی گردشیں قوموں کی زندگی میں آیا ہی کرتی ہیں۔ ایسے دن کچھ ہمارے ہی اوپر تو نہیں گزرے ہیں، ہمارے باپ دادوں پر بھی گزرے ہیں جو بڑے اچھے اور نیک نہاد لوگ تھے۔ یہ تو زمانے کے اتفاقات ہیں۔ کبھی تنگی ہے کبھی فراخی، کبھی فصل اچھی ہوئی، کبھی ماری گئی، کبھی سیلاب آگیا، کبھی قحط پڑ گیا، ان چیزوں کو اعمال و اخلاق سے باندھ دینا محض خردباختگی اور وہمی پن ہے۔

جس طرح آفات و مصائب کے ظہور کا مقصد لوگوں کو جھنجھوڑنا اور بیدار کرنا بتایا گیا ہے (لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ) اسی طرح اس امہال اور ڈھیل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان تنبیہات سے نہیں جاگے ہیں وہ بدمست ہو کر گہری نیند سو جائیں تاکہ خدا کا عذاب ان کو ایسی حالت میں دبوچے کہ ان کو خبر نہ ہو کہ کب آیا اور کہاں سے آیا۔ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔[1]

---

[1] اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم انعام کی آیات ۴۲-۴۹ کے تحت بھی کر چکے ہیں۔ نیز اعراف کی آیت ۱۳۰ کے تحت بھی اس کے بعض پہلو واضح ہوں گے۔

نیک وبد کے لیے مشترک تنبیہی آفتیں

یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جو آزمائشیں اور آفتیں لوگوں کے اندر توجہ الی اللہ یا قرآن کے الفاظ میں تضرع پیدا کرنے کے لیے آتی ہیں وہ عام اور مشترک ہوتی ہیں۔ ان میں نیک و بد دونوں ہی تپائے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال نادانوں اور سرکشوں کے لیے ایک وجہِ فتنہ و مغالطہ بن جاتی ہے۔ وہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب اس قحط یا وبا نے عقیدہ اور عقیدہ، کردار اور کردار میں کوئی فرق نہیں کیا، اس کا نشانہ جس طرح ہم بنے اسی طرح ہمارے ملامت گر اور ناصح بھی بنے تو یہ کس طرح تسلیم کیا جائے کہ اس کا کوئی رشتہ کفر و ایمان اور عقائد و اعمال سے ہے۔ یہ بات تو اس صورت میں صحیح ہوتی جب نبی اور اس کے ساتھی اس قحط یا آفت سے اس طرح بچا لیے گئے ہوتے کہ ان کے لیے تو آسمان سے من و سلویٰ اترتا ہوتا اور ہم سوکھے چمڑے چباتے ہوتے۔ جب یوں نہیں ہوا بلکہ ہم اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ گرفتارِ مصائب رہے تو یہ کس طرح مانا جائے کہ ان مصائب کا کوئی علاقہ لوگوں کی نیکی و بدی سے ہے۔ درحقیقت یہی مغالطہ ہے جو انبیا کے مخالفین کی طرح آج کے بدمستوں کو بھی اندھا بنائے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ سائیکلون اٹھا وہ بلا امتیاز نیک و بد سب کو بہا لے گیا۔ زلزلہ آیا اس نے مندر، مسجد، کلیسا سب ڈھا دیے، قحط آیا اور اس کی زد میں نمازی اور غیر نمازی، فاسق اور مومن سب آئے۔ یہ چیز ان کے لیے فتنہ بن جاتی ہے۔ اوّل تو وہ ان چیزوں سے کوئی صحیح اثر لیتے ہی نہیں اور اگر وقتی طور پر دلوں میں کچھ گداز پیدا ہوتا بھی ہے تو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ بہت جلد خواہشیں ان کو اسی غفلت و سرمستی میں مبتلا کر دیتی ہیں جس میں وہ اب تک مبتلا رہے تھے اور ان کا مرشد شیطان ان کو وہی جاہلی فلسفہ از سرِ نو پڑھا دیتا ہے جس کا ذکر اوپر گزرا کہ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ اس قسم کے سرد و گرم دن تو قوموں پر آتے ہی رہتے ہیں۔ اس ابلیسی مغالطہ سے محفوظ رہنے کے لیے اس حقیقت کو ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہیے کہ تنبیہی مصائب میں اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے نیک و بد میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا اس لیے کہ ان کا مقصود سزا دینا نہیں۔ بلکہ لوگوں میں تضرع پیدا کرنا ہوتا ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان اگر ان مصائب میں کوئی حصہ پاتے ہیں تو اس سے ان کے تضرع میں مزید اضافہ ہوتا ہے جس سے ان کی کوتاہیوں کی تلافی اور ان کے مراتب و مدارج میں ترقی ہوتی ہے۔ برعکس اس کے جن لوگوں کے اندر ان سے تضرع پیدا نہیں ہوتا ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور اس کے بعد جب ان پر فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو وہ ان کا استیصال کر دیتا ہے۔ پھر اس کی زد سے ان کے اندر کے وہی لوگ بچتے ہیں جو اصلاحِ منکر کا فرض ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔

دو اہم حقیقتیں

'وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا الاٰیۃ' 'اَهْلَ الْقُرٰٓى' سے مراد وہی قومیں ہیں جن کی تکذیب کی داستان اوپر بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتا کہ ایک مہلت دینے کے بعد ان کو عذاب میں پکڑ لیتا بلکہ ان کے لیے آسمان و زمین دونوں طرف سے اپنی بے پایاں برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔ یہاں دو حقیقتیں واضح

ہوتیں۔ ایک تو یہ کہ کسی قوم کو ڈھیل کے طور پر اسباب و مال کی جو فراخی حاصل ہوتی ہے وہ خدا کی رحمت و برکت نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت مریض کے آخری سنبھالے کی ہوتی ہے جس کے بعد ایک آخری ہچکی کی کسر باقی رہ جاتی ہے جو مریض کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جس طرح شمع بجھنے سے پہلے ایک مرتبہ بھڑکتی ہے پھر بجھ جاتی ہے اسی طرح یہ قوم آخری بار بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ ایمان و تقویٰ کی زندگی جس طرح آخرت میں خدا کی رحمتوں کی ضامن ہے اسی طرح دنیا میں بھی اگر کوئی قوم اس کو اختیار کرے تو یہ آسمان و زمین کی تمام برکتوں اور فیروزمندیوں کی کلید ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کامیابیوں کی راہ میں خدا پرستی اور خدا ترسی کوئی رکاوٹ ہے۔

اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ؕ اَوَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًى وَّهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ؕ اَفَاَمِنُوۡا مَكۡرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (۹۷-۹۹)

خدائی پکڑ بے امان ہوتی ہے

'اَهۡلُ الۡقُرٰٓى' سے اشارہ انھی قوموں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر گزرا۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قریش کو توجہ دلائی کہ بتاؤ وہ خدا کے عذاب کے مقابل میں اپنے بچاؤ کے لیے کوئی بند باندھ سکے؟ ہمارا عذاب ان پر رات کی تاریکیوں میں دبے پاؤں بھی آیا جب کہ وہ سو رہے تھے اور دن دہاڑے ڈنکے کی چوٹ بھی آیا جب کہ وہ اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں مصروف تھے لیکن نہ رات میں وہ اس سے اپنے آپ کو بچا سکے نہ دن میں۔ خدا کی تدبیر بے امان ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ اس سے اپنے کو بچا سکے۔ اس وجہ سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس سے نچنت اور بے خوف رہے۔ اس سے نچنت اور بے خوف صرف وہی رہتے ہیں جن کی شامت آئی ہوئی ہو اور وہ نامراد ہونے والے ہوں۔ 'مکر' جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں، خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہاں سے پکڑتا ہے جہاں سے کسی کو پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوپر تنبیہ کے بعد ڈھیل کی جو سنت بیان ہوئی وہ اس خفیہ تدبیر الٰہی کی ایک مثال ہے۔ قوم تو سمجھتی ہے کہ اب اس نے پالا مار لیا لیکن درحقیقت وہیں اس کی ہلاکت کا کھڈ ہوتا ہے۔

اَوَلَمۡ يَهۡدِ لِلَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَهۡلِهَاۤ اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ ۚ وَنَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ (۱۰۰)

'اَلَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ' سے مراد یہاں قریش ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ انھیں قوموں کے بعد جن کا ذکر اوپر گزرا اس ملک میں حکومت و اقتدار کے وارث ہوئے ہیں آخر وہ اپنے مورثوں کی تاریخ سے سبق کیوں نہیں لیتے، خدا نے جس ترازو اور جس باٹ سے ان کو تولا وہ اسی باٹ اور ترازو سے ان کو کیوں نہیں تولے گا؟ فرمایا کہ آخر وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس طرح ہم نے ان کو ان کے جرموں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اسی طرح، جب چاہیں، ان کو بھی ہلاک کر دیں۔

دلوں پر مہر قہر الٰہی کی تمہید ہے

'وَنَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ' بالکل اسی محل میں ہے جس محل میں سورۂ انعام میں فرمایا ہے قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَاَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ - ۴۶ (ان سے پوچھو

اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر مہر کردے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمھیں یہ چیزیں واپس دے سکے) یہ امر ملحوظ رہے کہ دلوں پر مہر عذابِ الٰہی کا مقدمہ ہے۔ کسی قوم پر عذابِ الٰہی نازل ہونے سے پہلے اس کے دلوں پر مہر لگتی ہے۔ اس باب میں خدا کا جو قانون ہے اس کی وضاحت ہم متعدد مقامات میں کرچکے ہیں۔ اسی کی دھمکی یہاں قریش کو دی ہے کہ ابھی تو ہم نے ان کے دلوں پر مہر نہیں کی ہے لیکن یہ ضد اور ہٹ دھرمی کی جس روش پر بڑھتے چلے جارہے ہیں وہ وقت دور نہیں کہ ہم ان کے دلوں پر مہر کردیں اور یہ سُننے سمجھنے سے بالکل ہی رہ جائیں۔ یہ ہمارے عذاب کا مقدمہ ہوگا جس کے بعد لازماً ہمارا فیصلہ کن عذاب نازل ہوجائے گا۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۱)

دلوں پر مہر کب لگتی ہے؟

دلوں پر مہر کب لگتی ہے؟ کس طرح کے لوگوں کے دلوں پر لگتی ہے اور بالآخر اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اس آیت میں ان سوالوں کا جواب ہے۔ فرمایا کہ ہم نے قوموں کی جو سرگزشت تمھیں سنائی ہے لوگوں کو چاہیے کہ اس سے سبق لیں۔ فرمایا کہ ان کے پاس خدا کے رسول نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ان پر ایمان لانے والے نہ بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے خدا کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلاتے رہے تھے۔ آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عام آیات سے روگردانی کا عادی ہوجاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا دل ایسا پتھر ہوجاتا ہے کہ رسولوں کے ذریعہ سے خاص نشانیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں تو وہ بھی اس پر کارگر نہیں ہوتیں۔ فرمایا کہ یہ طریقہ ہے ہمارے ہاں دلوں پر مہر لگانے کا۔ دل کا کام عبرت پذیری، تفکر اور تعقل ہے۔ اگر کوئی گروہ اس طرح اپنی خواہشوں کا اندھا بہرا مرید بن جاتا ہے کہ تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی وہ دل کی آنکھیں نہیں کھولتا تو ایسے لوگوں کے دل بالآخر بالکل چپاٹ ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'بِمَا كَذَّبُوْا' یہاں 'يُؤْمِنُوْا' کا مفعول نہیں ہے بلکہ 'ب' بیان سبب کے لیے ہے۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (۱۰۲)

یہ دلوں پر مہر لگنے کا نتیجہ اور اثر بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی گروہ کے دلوں پر مہر کردیا کرتا ہے تو ان کی مت اس طرح ماری جاتی ہے کہ کوئی نشانی بھی ان کو دکھاؤ وہ اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتے۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے عہد کریں گے کہ اگر فلاں معجزہ دکھا دو تو ہم مان لیں گے لیکن وہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے تو پھر کسی نئے معجزے کا مطالبہ شروع کردیں گے اور اپنے پہلے عہد سے پھر جائیں گے۔ لفظ 'فاسق' یہاں عہد شکن کے مفہوم میں ہے۔ یہی مضمون زیادہ وضاحت سے سورہ انعام میں یوں بیان ہوا ہے۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۱۰۹-۱۱۰

(اور وہ بڑی پکی قسمیں کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ ان کو دکھایا جائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا پتہ کہ اگر معجزہ بھی آجائے گا جب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی بصیرتوں کو اسی طرح اُلٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کی سرکشی میں ان کو بھٹکتا چھوڑ دیں گے) آگے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت میں بھی یہی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۱۳۴-۱۳۵ (جب ان پر کوئی آفت آتی وہ کہتے، اے موسیٰ، ہمارے واسطے اپنے رب سے، اس وعدے کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، دعا کرو۔ اگر تم نے یہ بلا ہمارے سر سے ٹال دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب ہم اس آفت کو کچھ دیر کے لیے، جس تک لازماً ان کو پہنچنا ہوتا، ٹال دیتے تو وہ دفعۃً اپنا عہد توڑ دیتے)

۱۴- آگے کا مضمون ___ آیات ۱۰۳-۱۷۱

آگے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کے دینی و سیاسی عروج و زوال کی پوری تاریخ، اجمال مگر نہایت جامعیت کے ساتھ سامنے رکھ دی گئی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ ان سرگزشتوں کا تکملہ اور تتمہ ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ اوپر کی سرگزشتیں حضرت شعیبؑ کی سرگزشت پر تمام ہوئی تھیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کی بعثت کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے جو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک طرف تو فرعون اور اس کی قوم پر اللہ کی حجت تمام ہوئی اور ان کی تکذیب کے نتیجے میں فرعون اور اس کی قوم کا وہی انجام ہوا جو اوپر قوم نوحؑ سے لے کر قوم شعیبؑ تک کا بیان ہوا۔ دوسری طرف بنی اسرائیل ایک قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور پھر بتدریج اللہ تعالیٰ نے ان کو مذہبی پیشوائی کا منصب بھی بخشا اور سیاسی دبدبہ اور اقتدار بھی عطا فرمایا لیکن انھوں نے اس منصب اور اقتدار کی قدر نہیں کی بلکہ آہستہ آہستہ ان برائیوں سے بھی زیادہ سنگین برائیوں میں مبتلا ہوئے جن میں پچھلی قومیں مبتلا ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جس طرح قریش کی قسمت خدا کی میزانِ عدل میں آگئی، اسی طرح بنی اسرائیل کی قسمت بھی کسوٹی پر رکھ دی گئی۔ اب ان کے فیصلہ کا وقت آگیا تھا کہ اگر اللہ سے باندھے ہوئے عہد کے مطابق اس نبی امّیؐ پر یہ ایمان نہیں لاتے جس پر تورات اور تمام پچھلے صحیفوں اور انبیاء کے ذریعہ سے ان سے اقرار لیا گیا تھا تو وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں جس سے پچھلی قومیں دوچار ہوئیں اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۰۳-۱۷۱ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا

بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى
يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ
اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ
مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ ع ۱۳ ۹ ۳
الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ
مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ
فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ
السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾
قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ
تُلْقِىَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا
سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا
يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا
هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ

لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿١٢٣﴾ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَ
أَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ
رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا
جَاءَتْنَا ۚ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿١٢٦﴾ وَقَالَ ۱۴ ع ۱۲ ۴
الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي
الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي
نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ
اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ
مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ
أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ
عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾ ۱۵ ع ۳ ۵
وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِنَ الثَّمَرَاتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٣٠﴾ فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ
وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا
طَائِرُهُمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوا
مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ
بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَ
الضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا

مُّجْرِمِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٣٤﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ
اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿١٣٥﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ
فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا
غٰفِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ
الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۚ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ
يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿١٣٧﴾ وَجٰوَزْنَا الربع
بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ
لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ
اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ
فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ
يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ
نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿١٤١﴾ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ع ١٦ ١٢ ٦
ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ
وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ

سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤٢﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ
قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ
فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ
جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ
اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ
عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ
تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا
بِاَحْسَنِهَا ۚ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ
الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ
وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ
الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٧﴾ ع
وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ
خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وقف لازم
وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿١٤٨﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ
ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

الْخٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ
بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِىْ مِنْۢ بَعْدِىْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ
وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ
اسْتَضْعَفُوْنِىْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِىْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِىَ الْاَعْدَآءَ وَلَا
تَجْعَلْنِىْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥٠﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِىْ وَلِاَخِىْ وَاَدْخِلْنَا
فِىْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١٥١﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا ع ١٨ ٣ ٨
الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُفْتَرِيْنَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا
مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٥٣﴾ وَ
لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِىْ نُسْخَتِهَا
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى
قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ
رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّاىَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا
فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ
تَهْدِىْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الْغٰفِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ
اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِىْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِىْ
وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ
يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٧﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ع ١٩ ٩
اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ
الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥٨﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ
يَعْدِلُوْنَ ﴿١٥٩﴾ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۚ وَاَوْحَيْنَآ
اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ
فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۚ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۚ
وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطِيْٓئٰتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ ع ۲۰ ۱۰
الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ وقف لازم
شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا معانقة
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰهُ النصف
مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى
رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ اَنْجَيْنَا
الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ
بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ
قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ
عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ
لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا
مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ
السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا
الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا
وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ
الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَ
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ

يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ

۲۱ ع ۹ ۱۱ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۳-۱۷۱

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول بنا کر بھیجا تو انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور نشانیوں کا انکار کیا۔ تو دیکھو ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا! اور موسیٰ نے کہا، اے فرعون، میں خداوند عالم کا فرستادہ ہوں۔ سزاوار اور حریص ہوں کہ اللہ کی طرف، حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں۔ میں تمھارے پاس تمھارے خداوند کی جانب سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو۔ اس نے جواب دیا کہ اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنی لٹھیا ڈال دی وہ یکایک ایک سچ مچ کا اژدہا بن گئی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ دفعتہً دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہوا نکلا۔ قوم فرعون کے اعیان نے کہا۔ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے تو تم کیا رائے دیتے ہو؟ بولے ابھی اس کو اور اس کے بھائی کو ٹالو اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجو جو تمام ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے تمھارے پاس لائیں۔ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے۔ بولے بڑا صلہ ملے گا ہمیں، اگر ہم ہی غالب رہے! فرعون نے کہا، ہاں بے شک، اور تم ہمارے مقربین میں بھی داخل ہو گے۔

۱۰۳-۱۱۲

بولے اے موسیٰ، یا تو پہلے تم پیش کرو یا ہمیں پیش کرنے والے بنتے ہیں۔ اس نے کہا تمھی پیش کرو۔ تو جب انھوں نے پیش کیا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان

پر دہشت طاری کردی اور بہت بڑا کرتب دکھایا۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنی لٹھیا ڈال دو، تو وہ دفعتہً نگلنے لگی اس کو جو وہ گھڑتے تھے۔ تو حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ سب نابود ہوا۔ تو اس وقت وہ مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے۔ اور ساحر سجدے میں گر پڑے۔ بولے ہم عالم کے خداوند، موسیٰؑ اور ہارون کے خداوند —— پر ایمان لائے!! ۱۱۵-۱۲۲

فرعون نے کہا تم لوگ، میری اجازت کے بغیر اس پر ایمان لائے۔ یہ ایک سازش ہے جو تم نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ اس کے باشندوں کو یہاں سے نکالو۔ تو تم عنقریب، جان لوگے۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ وہ بولے، ہم اپنے رب ہی کی طرف تو لوٹیں گے! تم ہمارے درپئے آزار صرف اس غصہ میں ہو رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں وفات اسلام پر دے۔ ۱۲۳-۱۲۶

اور قوم فرعون کے اعیان نے فرعون سے کہا کیا تو اسی طرح موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلائیں اور تجھ کو اور تیری مورتوں کو ٹھکرائیں؟ اس نے کہا کہ ہم ان کے ذکور کو قتل کریں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر پوری طرح حاوی ہیں۔ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کو اس کا وارث بناتا ہے اور انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ وہ بولے ہم تو تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ اس نے

کہا توقع ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو ملک کا وارث بنائے گا

کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو! ۱۲۷-۱۲۹

اور ہم نے آلِ فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو تنبیہ ہو۔ تو جب خوش حالی آتی، کہتے، یہ تو ہے ہی ہمارا حصہ اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔ سن رکھو کہ ان کی قسمت اللہ ہی کے پاس ہے لیکن ان میں کے اکثر نہیں جانتے۔ اور کہتے ہیں کہ خواہ تم کیسی ہی نشانی ہمیں مسحور کرنے کے لیے لاؤ ہم تو تمھاری بات، باور کرنے کے نہیں۔ تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں، تو انھوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ رہے تھے۔ اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسیٰؑ تم اپنے رب سے، اس عہد کے واسطہ سے جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر تم نے ہم سے یہ آفت، دور کر دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ تو جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے تو وہ دفعتہً عہد توڑ دیتے۔ تو ہم نے ان کو کیفرِ کردار کو پہنچا دیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا بوجہ اس کے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا بنے رہے۔ اور جو لوگ، دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث ٹھہرایا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات اور ان کے سارے باغ و چمن ملیامیٹ

کر دیے۔ ۱۳۶-۱۳۰

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا تو ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا، اے موسیٰ جس طرح ان کے دیوتا ہیں اسی طرح کا ایک، دیوتا تم ہمارے لیے بھی بنا دو۔ اس نے کہا تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ ان لوگوں کا یہ سب کچھ جس میں یہ لگے ہوئے ہیں برباد اور جو کچھ کر رہے ہیں نابود ہونے والا ہے! اس نے کہا۔ کیا میں تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تم کو اہلِ عالم پر فضیلت بخشی ہ اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات دی جو تمھیں نہایت برے عذاب چکھاتے تھے، وہ تمھارے بیٹوں کو بے دردی سے قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا، میری قوم میں میری جانشینی کرنا، اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش میں آیا، بولا: تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا

اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔ فرمایا، اے موسیٰ میں نے تم کو لوگوں پر اپنے
پیغام اور اپنے کلام سے سرفراز کیا تو میں نے جو کچھ تم کو دیا اس کو لو اور شکر گزاروں میں
سے بنو اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ پس
اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ اس کے بہتر طریقہ کو اپنائیں۔ میں تم
کو عنقریب نافرمانوں کا ٹھکانا دکھاؤں گا۔ میں ان لوگوں کو جو زمین میں ناحق گھمنڈ کرتے
ہیں اپنی نشانیوں سے برگشتہ کروں گا اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو بھی
ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ اگر ہدایت کی راہ دیکھیں گے تو اُسے تو نہ اپنائیں گے اور اگر
گمراہی کی راہ دیکھیں گے تو اسے اپنائیں گے۔ یہ اس وجہ سے کہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں
کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا بنے رہے۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کی
ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ڈھے گئے اور وہ بدلے میں وہی پائیں گے جو وہ
کرتے رہے۔ ۱۴۷-۱۳۸

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا۔ ایک دھڑ
جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ نہ وہ ان سے بات
کرسکتا ہے اور نہ ان کو کوئی راہ دکھا سکتا ہے! اس کو وہ بنا بیٹھے اور وہ اپنے اوپر
بڑے ظلم ڈھانے والے تھے! اور جب ان کو تنبہ ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ وہ تو گمراہ
ہو گئے تو بولے کہ اگر ہمارے پروردگار نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارا قصور معاف نہ کیا
تو ہم نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔ اور جب موسیٰ رنج اور غصہ سے بھرے ہوئے
اپنی قوم کی طرف لوٹے، بولے تم نے میرے پیچھے میری بہت بُری جانشینی کی۔ کیا تم نے

خدا کے حکم سے پہلے ہی جلد بازی کردی ؟ اور اس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف گھسیٹنے لگا ۔ وہ بولا اے میرے ماں جائے! قوم کے لوگوں نے مجھے دبا لیا، قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے تو میرے اوپر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دے اور میرا شمار ظالموں کے ساتھ نہ کر۔ موسیٰ نے دعا کی، اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر، ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو ارحم الراحمین ہے ۔ ۱۴۸-۱۵۱

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کو ان کے رب کی طرف سے غضب لاحق ہوگا اور ذلت، دنیا کی زندگی میں اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو۔ پر جنھوں نے بُرے کام کیے، پھر اس کے بعد انھوں نے توبہ کر لی اور ایمان لائے تو اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے ۔ ۱۵۲-۱۵۳

اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہُوا اس نے تختیاں اٹھائیں اور اس کے نوشتہ میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہوں ۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی چنے ہمارے وقت مقرر کے لیے تو جب ان کو زلزلہ نے آ پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے رب اگر تو چاہتا ان کو ہلاک کر چھوڑتا پہلے ہی اور مجھ کو بھی ۔ کیا تو ہمیں ایک ایسے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دے گا جس کا ارتکاب ہمارے اندر کے بے وقوفوں نے کیا ۔ یہ تو بس تیری ایک آزمائش تھی ۔ تو اس سے جس کو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے ہدایت دے ۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین بخشنے والا ہے ۔ اور تو ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی ۔ ہم نے تو تیری طرف رجوع کیا ۔ فرمایا، میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور

میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقوٰی اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے —— جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اتارتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔ تو جو اس پر ایمان لائے، جنھوں نے اس کی عزت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۵۶-۱۵۷

کہہ دو اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس اللہ کا جس کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امی رسول پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو۔ ۱۵۸

اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوا جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اسی کے مطابق انصاف کرتے اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں الگ الگ امتیں بنا دیا اور ہم نے موسیٰ کی طرف، جب اس کی قوم نے پانی طلب کیا، وحی کی کہ اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معین کر لیا اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا اور ان پر من اور سلوٰی اتارا۔ کھاؤ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے۔ اور انھوں نے کچھ ہمارا نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے (۱۵۹-۱۶۰)

اور یاد کرو، جب ان سے کہا گیا، اس بستی میں رہو بسو، اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ پیو اور توبہ استغفار کرتے رہو اور دروازے میں سرفگندہ داخل ہو تو ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ خوب کاروں کو ہم مزید نوازیں گے۔ تو ان میں سے ان لوگوں نے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اس کو بدل دیا کہی ہوئی بات سے مختلف بات سے، تو ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی بوجہ اس کے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ ۱۶۱-۱۶۲

اور ان سے اس بستی کا حال دریافت کرو جو دریا کے کنارے تھی جب کہ وہ سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتے تھے۔ جب سبت کا دن ہوتا تو ان کی مچھلیاں منہ اٹھائے ہوئے ان کے سامنے نمایاں ہوتیں اور جب سبت کا دن نہ ہوتا تو وہ ظاہر نہ ہوتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزماتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جا رہے ہو جنھیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انھیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمھارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تاکہ یہ خدا کے غضب سے بچیں۔ تو جب انھوں نے بھلا دی وہ چیز جس سے ان کو یاددہانی کی گئی تو ہم نے ان لوگوں کو تو نجات دی جو برائی سے روکنے والے تھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے۔ تو جب وہ سرکشی کر کے اس چیز سے باز نہ آئے جس سے روکے گئے تو ہم نے ان سے کہا جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ۔ ۱۶۳-۱۶۶

اور یاد کرو جب تیرے رب نے فیصلہ کیا کہ وہ روز قیامت تک ان پر ایسے لوگوں

کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت برے عذاب چکھاتے رہیں گے ۔ بے شک تیرا رب جلد پاداش دینے والا اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے ۔ اور ہم نے ان کو زمین میں منتشر کر دیا گروہ گروہ کر کے ۔ ان میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف بھی ۔ اور ہم نے ان کو خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا تاکہ وہ رجوع کریں تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین وارث کتاب ہوئے جو اس دنیا کی متاع اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر اسی طرح کی کوئی اور متاع ان کو مل جائے تو اسے بھی ہتھیا لیں گے ۔ کیا ان سے درباب کتاب یہ میثاق نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ جوڑیں اور انھوں نے جو کچھ اس میں ہے اس کو اچھی طرح پڑھا بھی ۔ اور دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں ، تو کیا تم سمجھتے نہیں ؟ اور جو لوگ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے ۔ اور یاد کرو جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو معلق کر دیا گویا وہ سائبان ہے اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے ، پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم خدا کے غضب سے محفوظ رہو ۔ ۱۶۷ ۔ ۱۷۱

۵ـ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰۳)

'مِنْۢ بَعْدِهِمْ' میں ضمیر کا مرجع وہ رسول اور ان کی قومیں ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۵۹ سے آیت ۹۲ تک گزرا ۔

حضرت موسیٰ کی دعوت دوسرے انبیاء کی دعوت کے ہم رنگ تھی

'بِاٰیٰتِنَآ'۔ 'اٰیات' سے مراد وہ معجزات بھی ہیں جو حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو دکھائے اور توحید، قیامت اور رسالت کے وہ فطری اور عقلی دلائل بھی جو حضرت موسیٰ اور ہارونؑ نے نہایت فصاحت کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کیے۔ یہ دلائل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں۔ ہم انشاء اللہ سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ان پر روشنی ڈالیں گے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت اصلاً عقل و فطرت کے بیّنات پر مبنی ہوتی ہے۔ حسّی معجزات نبوت کے لوازم میں سے نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہیں۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو حسّی معجزات بھی عطا فرماتا ہے۔ آگے ہم مناسب موقع پر واضح کریں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے ان کی ذمہ داری صرف اسی قدر نہیں تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے آزاد کرالیں بلکہ یہ ذمہ داری بھی ان پر تھی کہ اس کو ایمان و اسلام کی دعوت دیں۔ چنانچہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے یہ فریضۂ رسالت انجام دیا اگرچہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ ایمان نہ لائے۔ صرف تھوڑے لوگ ایمان لائے اور انھوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہجرت بھی کی۔ یہاں اس اجمالی اشارہ پر قناعت کیجیے تفصیلات آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔ تورات میں، اس کے مرتّبوں کی مخصوص ذہنیتوں کی وجہ سے، حضرت موسیٰ کی سرگزشت ایک قوم پرست لیڈر کی سرگزشت بن گئی ہے حالانکہ حضرت موسیٰ ایک جلیل القدر نبی اور رسول تھے۔ ان کی دعوت دوسرے انبیا کی دعوت اور ان کا طریقۂ کار دوسرے رسولوں کے طریقۂ کار سے بالکل مختلف کس طرح ہو سکتا ہے؟

'ظَلَمُوْا بِهَا'۔ 'ظَلَمُوْا' کے ساتھ قرآن میں جہاں جہاں 'ب' کا صلہ آیا ہے وہاں یہ لفظ 'کَفَرُوْا' اور 'جَحَدُوْا' وغیرہ کے معنی پر متضمن ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم اور اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں گزر چکی ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس اسلوب کے مضمر مضمون کو کھول دیا ہے۔

سرگزشت موسیٰ اور فرعون کی تفصیل کی حکمت

اوپر اقوام عرب کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں اب ان کی تکمیل یہ حضرت موسیٰ، قوم فرعون اور بنی اسرائیل کی سرگزشت سے کی جا رہی ہے۔ یہ سرگزشت، جیسا کہ آپ نے دیکھا، نسبتۂ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ یہ سرگزشت ماضی کی کوئی بھولی بسری داستان نہیں تھی بلکہ اس کا تاریخی ریکارڈ (تحریف و تغیر کے ساتھ سہی) تورات میں موجود تھا اور بنی اسرائیل جو اس کے حامل ہونے کے مدعی تھے وہ بھی سامنے موجود تھے۔ دوسری یہ کہ یہ بنی اسرائیل ہی تھے جن سے خدا نے اپنے دین و شریعت کی امانت واپس لی اور یہ امانت اس امت کے حوالہ کی اس وجہ سے اس سرگزشت کا ہر حصہ اپنے اندر درس موعظت رکھتا ہے، اس امت کے لیے بھی اور بنی اسرائیل کے لیے بھی۔

'فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ'۔ اس سرگزشت کے سنانے کی جو اصل غایت ہے، یہ اس

کی طرف اشارہ ہے تاکہ قاری کی توجہ اصل ہدف سے ہٹنے نہ پائے۔ اس سورہ کے عمود کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں قریش کو، تاریخ کی روشنی میں، یہ آگاہی دی جا رہی ہے کہ تمھارے اندر ایک رسولؐ کی بعثت نے اب تمھیں خدا کی میزانِ عدل میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر تم نے اس رسول کی تکذیب کر دی تو تم خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والے ٹھہرو گے اور تمھارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے دوسرے مفسدین کا ہو چکا ہے۔ یہ بات یہاں واضح رہنی چاہیے کہ صلاح و فلاح کا تمام منبع نبی کی دعوت ہوتی ہے۔ رسول جو نظامِ زندگی پیش کرتا ہے وہی نظام سب کی اصلاح کا ضامن ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی تکذیب اور مخالفت خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے کے ہم معنی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ
قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۱۰۴-۱۰۵)

'حقیق علی' کا مفہوم

'حَقِیْقٌ'، 'حَقٌّ' اور 'حُقَّ' سے فعیل کا وزن ہے اور معنی میں مفعول کے آتا ہے۔ اس کے معنی لائق، اہل اور سزاوار کے ہیں۔ مثلاً کہیں گے 'هُوَ حَقِیْقٌ بِہٖ' وہ اس کا اہل اور سزاوار ہے 'هُوَ حقیق ان یفعل کذا' وہ اہل ہے کہ فلاں کام سرانجام دے۔ اگر اس کے ساتھ 'علی' آئے، جیسا کہ یہاں ہے تو، جیسا کہ صاحب اقرب الموارد نے تصریح کی ہے، اس کے معنی 'حریص' کے ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک اس کے ساتھ 'علی' سے اس کے اصل مفہوم کے اندر یہ ایک اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ اضافہ اسی قاعدۂ تضمین کے تحت ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر 'ظَلَمُوْا بِهَا' میں گزرا۔ اس وضاحت کی روشنی میں 'حقیق علی ان لا الآیۃ' کا ترجمہ میرے نزدیک یہ ہوگا کہ میں اہل اور حریص ہوں اس بات کا کہ خدا پر نہ لگاؤں مگر وہی بات جو حق ہے، ظاہر ہے کہ جو خدا کا رسول اور سفیر ہو وہی سب سے زیادہ اہل اس بات کا ہو سکتا ہے کہ خدا کی صحیح صحیح ترجمانی کرے، اس پر کوئی من گھڑت بات نہ لگائے اس لیے کہ اس کا علم ظن و قیاس پر نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی وحی اور خطاب پر مبنی ہوتا ہے اور اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہ اس بات کا نہایت حریص بھی ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے کوئی کلمہ حق کے خلاف نہ نکلے اس لیے کہ جس پرسش کا خوف اسے ہوتا یا ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

معجزات کے باب میں حضرت موسیٰ کے ساتھ خاص معاملہ

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ 'بینۃ' سے مراد یہاں 'عصا' اور 'ید بیضا' کا وہ معجزہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلح کر کے فرعون کے پاس بھیجا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ چونکہ فرعون کی سرکشی اور اس کے تمرد سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تو وہ اس بارِ گراں سے بہت مضطرب ہوئے۔ انھوں نے عرض کی کہ فرعون اور اس کے درباری میری بات سننے والے نہیں ہیں، وہ میری بات تب سنیں گے جب مجھے کوئی ایسی کھلی ہوئی نشانی عطا ہو جو ان کو مرعوب کر سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس خاص حالت کے سبب سے شروع ہی میں حضرت موسیٰؑ کو یہ

معجزے عطا فرمائے اور چونکہ حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کے درباریوں کی ذہنیت سے آگاہ تھے اس وجہ سے انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے ان معجزات کا مظاہرہ بھی کر دیا تاکہ فرعونیوں کے کبر پر کچھ ضرب لگے اور وہ ان کی بات سننے پر آمادہ ہوں۔

بنی اسرائیل کو لے جانے کے مطالبہ کی نوعیت

'فَاَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' (میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے) یہاں دو سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے کوئی دعوت نہیں پیش کی، بس بلا تمہید یہ مطالبہ ہی ان کے سامنے رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے؟ دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں انبیا اور اقوام کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں وہ مختلف سورتوں میں، سورتوں کے عمود و مضمون کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان ہوئی ہیں۔ ہر سورہ میں سرگزشت کا اتنا ہی حصہ زیر بحث آیا ہے جتنے کے لیے سورہ کا مزاج مقتضی ہوا ہے۔ یہ سورہ، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، صرف انبیاء کے مکذبین کے انجام کو ظاہر کر رہی ہے اس وجہ سے اس میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا صرف وہی حصہ نمایاں ہوا ہے جو سورہ کے موضوع کو اجاگر کرنے والا ہے، اس کے بقیہ اجزا دوسری سورتوں میں اپنے اپنے مواقع کی مناسبت سے آئے ہیں۔ چنانچہ دوسری سورتوں میں خشیت اور تذکر کی اس دعوت کا بھی ذکر ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی عام سنت کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو دی اور توحید و معاد سے متعلق اس مناظرے کا بھی ذکر ہے جو فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان ہوا۔ انشاء اللہ سورۂ طٰہٰ یا کسی اور مناسب محل میں یہ چیزیں زیر بحث آئیں گی۔

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ قرآن میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ تورات کی کتاب خروج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ابتداءً یہ مطالبہ فرعون کے سامنے اس شکل میں رکھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ عبادت کے لیے جانے دے۔ فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے صاف انکار کر دیا بلکہ غصہ میں آکر بنی اسرائیل کی بیگار اور مشقت میں اس نے مزید اضافہ کرنے کے احکام جاری کر دیے کہ یہ کاہل اور کام چور ہو گئے ہیں اسی وجہ سے عبادت وغیرہ کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ پھر حضرت موسیٰؑ کے معجزوں سے زچ ہو کر جب وہ ذرا نرم پڑا تو اس نے دریافت کیا کہ تم کہاں عبادت کے لیے جانا چاہتے ہو، یہ عبادت اسی شہر میں کیوں نہیں کر لیتے؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا کہ ہم اس عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جائیں گے، یہاں ہم یہ عبادت اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہم جس چیز کی قربانی کرنا چاہتے ہیں اس کی قربانی اگر ہم نے یہاں کی تو یہ مصری ہمیں سنگسار کر دیں گے۔ یہ جھگڑا عرصہ تک حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان چلتا رہا۔ بالآخر ان آفتوں سے تنگ آکر جو حضرت موسیٰؑ کے معجزوں سے ظاہر ہوئیں، درباریوں نے فرعون کو مجبور کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو جہاں جانا چاہتے ہیں جانے دے ورنہ

موسیٰ کے ہاتھوں مصر تباہ ہو جائے گا۔ فرعون نے مجبور ہو کر اجازت تو دے دی لیکن جب حضرت موسیٰ اپنی پوری قوم کو زن و فرزند، مال مویشی اور جملہ اسباب و سامان کے ساتھ لے کر نکلے تو اس کو احساس ہوا کہ یہ اجازت دینے میں اس نے غلطی کی۔ چنانچہ اس نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا کہ مجبور کر کے ان کو واپس لائے لیکن یہ تعاقب اس نتیجہ پر منتہی ہوا کہ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے اپنی پوری اسکیم واضح نہیں فرمائی تھی۔ صرف اتنا ظاہر کیا کہ وہ تین دن کی راہ بیابان میں جا کر خدا کی عبادت اور قربانی کرنا چاہتے ہیں اور قربانی بھی خاص طور پر گائے کی کرنا چاہتے ہیں جس سے قبطیوں نے بنی اسرائیل کو اسی طرح محروم کر رکھا تھا جس طرح بھارت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو محروم کر رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ نے چاہا کہ مصر کے غلامانہ ماحول سے الگ لے جا کر بنی اسرائیل کو منظم اور ان کے اندر ان تمام دینی روایات کو از سر نو زندہ کریں جو مصر کی محکومانہ زندگی میں بالکل مردہ ہو چکی تھیں۔ ہمارا قیاس ہے کہ اس مقصد کے لیے وہ سینا کے اسی علاقے میں جانا چاہتے ہوں گے جہاں انھوں نے مدین سے واپسی کے موقع پر خدا کی تجلی دیکھی تھی اور پھر جہاں ان کو اس ہجرت کے سفر میں احکام عشرہ کی الواح عطا ہوئیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالبہ کے منوانے میں حضرت موسیٰ کے کئی سال صرف ہو گئے۔ اس مدت میں انھوں نے اپنے گوناگوں معجزات اور اپنے داعیانہ دلائل سے ایک طرف تو فرعون اور مصریوں پر اللہ کی حجت تمام کر دی، دوسری طرف بنی اسرائیل کو آزمائش کی مختلف بھٹیوں سے گزار کر اس قابل کیا کہ وہ از سر نو شریعت الٰہی کی امانت کے حامل بن سکیں۔ اس طرح بالآخر رسولوں کی معروف سنت کے مطابق ان کے لیے وقت آگیا کہ وہ ہجرت فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے ہجرت فرمائی اور اس ہجرت سے ان کے اور ان کے باایمان ساتھیوں کے لیے نجات و فلاح کی راہ کھلی اور ان کے دشمن عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ ہجرت کے باب میں، جیسا کہ ہم مختلف مقامات میں واضح کر چکے ہیں، سنت الٰہی یہی ہے اور یہ سنت جس طرح تمام رسولوں کے معاملے میں ظاہر ہوئی اسی طرح حضرت موسیٰ کے معاملے میں بھی ظاہر ہوئی۔

یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ جو لوگ مزید تفصیل کے طالب ہوں وہ ہمارے مجموعۂ مضامین میں وہ مضمون پڑھیں جو ہم نے خاص اسی موضوع پر لکھا ہے[۱]۔ اس میں ہم نے دکھایا ہے کہ حضرت موسیٰ کی جدوجہد ہر پہلو سے ٹھیک ٹھیک انبیا و رسل کے معروف طریقہ کے مطابق تھی۔ جن لوگوں نے ان کو نعوذ باللہ ایک قوم پرست لیڈر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے 'اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' کا مطلب غلط سمجھا ہے۔

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۰۶-۱۰۸)

---

[۱] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "تنقیدات"۔

معجزات کے باب میں سنت الٰہی

فرعون کے لیے یہ بات نہایت عجیب تھی کہ ایک شخص، وہ بھی اس کی رعیت میں سے، اس کے پاس خدا کا رسول ہو کر آئے۔ وہ خود، جیسا کہ ہم خود دوسرے مقام میں تصریح کر چکے ہیں، اپنے آپ کو سب سے بڑے دیوتا یعنی سورج کا اوتار اور لوگوں کا رب اعلیٰ بنائے بیٹھا تھا اس وجہ سے اس نے سنتے ہی کہا، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم خدا کے رسول ہو کر آئے ہو تو اپنے رسول ہونے کی کوئی نشانی دکھاؤ۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کے مطالبے پر 'عصا' اور 'ید بیضا' کے معجزے دکھائے۔ معجزات کے باب میں سنت الٰہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور رجحانات کی رعایت سے دیے جاتے ہیں تاکہ ان پر حجت ہو سکیں۔ مصر میں، تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں سحر و شعبدہ کا بڑا زور اور سوسائٹی میں ساحروں کو بڑا مقام حاصل تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ایسے معجزے دیے جن سے ساحروں کے طلسم کو باطل کیا جا سکے۔ عربوں میں اس کے برعکس، سب سے زیادہ قدر و عظمت فصاحت و بلاغت کو حاصل تھی اور سوسائٹی پر دھاک خطیبوں اور شاعروں کی بیٹھی ہوئی تھی، اس وجہ سے ہمارے حضورؐ کو قرآن کا معجزہ عطا ہوا جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے فصیحوں بلیغوں کو عاجز و درماندہ کر دیا۔ یہاں 'ثُعْبَانٌ' کے ساتھ 'مُّبِيْنٌ' کی صفت آئی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ لاٹھی سچ مچ کا اژدہا بن گئی، ایسا کھلا اژدہا کہ کسی کے لیے ذرا شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ بات نہیں تھی کہ ایک چیز محض رینگنے لگ گئی ہو یا اس کے اندر سر اور دم نمایاں ہو گئی ہو بلکہ عین مین اژدہا اپنی تمام خصوصیات و صفات کے ساتھ۔ اسی طرح 'بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ' میں ناظرین کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوتی تھی وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہیں تھی بلکہ غور و تامل سے دیکھنے والوں کو اس کی تابانی بالکل اصلی و حقیقی معلوم ہوتی۔ یہ ملحوظ رہے کہ 'نظر' کا لفظ اصلاً عربی میں غور و تامل سے دیکھنے کے لیے آتا ہے۔

معجزہ اور سحر میں امتیاز

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ معجزہ اور سحر و شعبدہ میں امتیاز منطقی تعریف کے ذریعہ سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کا اصلی فرق دو چیزوں سے نمایاں ہوتا ہے۔ اول تو باہمی تقابل سے جس طرح مسِ خام اور کندن کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو دونوں کا فرق صاف نمایاں ہو جائے گا اسی طرح جب ایک شخص معجزہ اور سحر کو ایک دوسرے کے مقابل میں دیکھتا ہے تو معجزے کی سطوت و جلالت، اس کے ظہور کا انداز، باطل پر اس کا غلبہ اور اس کی تہمانیت پکار کر شہادت دیتی ہے کہ یہ کمہاروں کی مٹی سے بنا ہوا کھلونا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کہیں اور ہی سے ہے۔

گوہر جامِ جم از کانِ جہانِ دگر است

دوسری چیز پیش کرنے والے کی شخصیت اور کردار ہوتی ہے۔ سحر و شعبدے دکھانے والے ہمیشہ سوسائٹی کے اراذل و انفار ہوئے ہیں، جن کی ذلت و نکبت، جن کے اخلاق کی پستی اور طبیعت کی دنائت و رذالت ہمیشہ ضرب المثل رہی ہے۔ برعکس اس کے معجزے ان لوگوں کے ہاتھوں ظاہر ہوئے ہیں جو انسانیت کے گلِ سرسبد

مانے گئے ہیں، جن سے دنیا نے علم و عمل اور حکمت و معرفت کے سبق سیکھے ہیں، جن کی زندگی کا ہر دور اور جن کا ہر قول و فعل اسوہ اور نمونہ قرار پایا ہے، جو زندگی کی سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی ہمیشہ سو فی صدی کھرے پائے گئے ہیں۔ یہاں ان اشارات پر کفایت کیجیے۔ آگے مناسب مواقع سے ان کی تفصیل آئے گی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ۝ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۝ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ۱۰۹ - ۱۱۲ -

'قَالَ الْمَلَاُ الآیۃ' یہ وہ مشورت ہے جو فرعون کے درباریوں نے حضرت موسیٰ کے معجزے دیکھ کر پہلے آپس میں کی، پھر اپنی طے شدہ رائے فرعون کی خدمت میں پیش کی۔ انھوں نے رائے یہ قائم کی کہ یہ شخص کچھ ایسا ویسا جادوگر نہیں ہے بلکہ بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس کے پیش نظر صرف وہی نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہا ہے بلکہ یہ بنی اسرائیل کو منظم کر کے یہ چاہتا ہے کہ ہم کو ہمارے ملک سے بے دخل کر دے۔

فرعون اور اس کے درباریوں کا سیاسی سٹنٹ

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ فی الواقع ان کے دل میں بھی وہی بات رہی ہو جو زبان پر آئی۔ وہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے ماضی و حاضر اور ان کے اخلاق و کردار کو سامنے رکھ کر وہ آسانی سے فیصلہ کر سکتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ نہ تو کوئی جادوگر ہو سکتے اور نہ اصلاح کے سوا ان کے سامنے کوئی اور مقصد ہو سکتا لیکن ارباب اقتدار کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ جب ان کے مقابل میں کوئی اصلاحی دعوت اُٹھی ہے تو انھوں نے اپنے عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کے اندر کوئی نہ کوئی خطرناک سیاسی معنی و مفہوم پیدا کرنے کی ضرور کوشش کی ہے۔ یہی حرکت فرعون کے درباریوں نے کی۔ انھوں نے حضرت موسیٰ کی اس خالص اصلاحی دعوت اور جد و جہد کو متہم کرنے کے لیے یہ اشغلا چھوڑا کہ یہ درحقیقت ارسٹوکریسی کو اس ملک سے بے دخل کرنے کی ایک سازش ہے۔

فرعون کے درباریوں کا یہ اسٹنٹ وقت کے حالات کے لحاظ سے ایک موثر اور کارگر اسٹنٹ تھا۔ یہ مصر کے جس دور کی سرگزشت بیان ہو رہی ہے اس دور کی تاریخ تورات میں پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں فرعون اور اس کے اعیان اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ طاقت پکڑ جائیں اور ایک دن ہمیں اس ملک سے نکال چھوڑیں۔ تورات کی کتاب خروج سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اور اسرائیل کی اولاد برومند اور کثیر التعداد اور فراواں اور نہایت زورآور ہوگئی۔ اور وہ ملک ان سے بھر گیا۔

تب مصر میں ایک نیا بادشاہ پیدا ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں کو کہا دیکھو اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے

نکل جائیں۔ اس لیے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے لے کر ان کو ستائیں ۔۔۔۔ پر انھوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھتے اور پھیلتے گئے اس لیے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکرمند ہو گئے ۔۔۔۔۔۔ تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے تم بچہ جناؤ ۔۔۔۔۔ تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے ۔۔۔۔۔ اور فرعون نے اپنی قوم کے سب لوگوں کو تاکیداً کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دینا اور جو بیٹی ہو اسے جیتی چھوڑنا۔

(خروج باب ۱، ۷ — ۲۲)

یہ طویل اقتباس ہم نے محض اس لیے پیش کیا ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ مصر کی ارسٹو کریسی بنی اسرائیل کی تعداد اور ان کی قوت سے اس زمانے میں کس درجہ تشویش میں مبتلا تھی اسی زمانے میں حضرت موسیٰ کی دعوت بلند ہوتی ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ وہ تمام بنی اسرائیل کو تین دن کی راہ بیابان میں عید قربان منانے کے لیے لے جانے کا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں فرعون کے اعیان کے پاس اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ اور ان کی دعوت سے دہشت زدہ کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر حربہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ یہ شگوفہ چھوڑیں کہ اب وہ خطرہ سامنے آگیا ہے جس کا ڈر لگا ہوا تھا یعنی یہ شخص بنی اسرائیل کو منظم کر کے اب تمھیں اس ملک سے بے دخل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے تو تم اپنا تحفظ چاہتے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے کمر کس لو۔

'قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ' یہ وہ مشورہ ہے جو پورے اتفاق رائے کے ساتھ درباریوں کی طرف سے فرعون کو پیش کیا گیا۔ وہ یہ کہ موسیٰ اور ہارون کے معاملے میں کوئی عاجلانہ کارروائی مناسب نہیں ہوگی۔ تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ ابھی ان کو ٹالیے اور مملکت کے تمام حصوں میں ہرکارے بھیج کر ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو جمع کیجیے تاکہ وہ کسی پبلک اجتماع میں اپنے فن سے موسیٰ اور ہارون کو ایسی شکست دیں کہ ان کی ہوا اکھڑ جائے۔ اگر عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرایا گیا تو اندیشہ ہے کہ وہ اس مقابلہ میں شکست کھا جائیں گے اور الٹے ہماری ہوا خیزی ہوگی۔

'اَرْجِهْ' اصل میں 'اَرْجِئْهُ' ہے۔ 'اِرْجَاءٌ' کے معنی ٹالنے، کسی معاملے کو کسی دوسرے وقت پر محول کرنے، کسی کو منتظر بنانے کے ہیں۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں یہ ہمزہ کے حذف اور 'ہ' کے سکون کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ تلفظ کا یہ اسلوب اہل عرب کے قاعدے کے مطابق ہے۔ بعض مرتبہ وہ لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے اس طرح کا تصرف کر دیتے ہیں۔ صاحب لسان نے اس کی بعض واضح مثالیں نقل کی ہیں۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۱۱۳ - ۱۱۴)

یہاں قرآن نے اپنے معروف طریقہ کے مطابق سرگزشت کا غیر ضروری حصہ نظر انداز کر دیا ہے۔ یعنی درباریوں کی اس صلاح کے بموجب فرعون نے مملکت کے تمام شہروں کو ہرکارے دوڑائے جو ہر جگہ سے ماہر فن جادوگروں کو جمع کر کے لائے اور ان کو فرعون کے دربار میں حاضر کیا۔ چونکہ یہ بات موقع کلام سے خود واضح تھی اس وجہ سے اس کو

نظرانداز کر کے آگے کی بات لے لی کہ ساحروں نے سامنے آتے ہی پیشہ وروں کے عام طریقہ کے مطابق خوشامدانہ انداز میں اپنے اس ارمان اور توقع کا اظہار کیا کہ اگر ہم نے بازی جیتی تو سرکار سے بڑا انعام ملے گا۔ فرعون نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، انعام تو جو ملنا ہے ملے گا ہی، تم پر مزید نوازش یہ ہوگی کہ تم خاص مقربین میں شامل کیے جاؤ گے۔

ساحروں کی اخلاقی پستی ایمان لانے سے پہلے

قرآن نے ساحروں کی اس حرص و طمع کا اظہار خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ واضح ہو جائے کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی اخلاقی پستی اور دنائت کا کیا حال ہوتا ہے۔ پھر آگے چل کر انہی ساحروں کا وہ انقلاب حال نمایاں کیا ہے جو ایمان کی دولت نصیب ہوتے ہی ان کے اندر پیدا ہوا کہ مال و زر کی طمع تو درکنار ان کو اپنی جان کی بھی کوئی پروا نہیں رہی اور فرعون کی دھمکی کے جواب میں انھوں نے صاف سنا دیا کہ جو کرنا ہے کر گزرو، ہمیں کوئی پروا نہیں ہے۔ 'اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ'۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (۱۱۵-۱۱۶)

حضرت موسیٰ کا اعتماد اللہ پر

ساحروں نے اپنے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگرچہ پیش کش تو حضرت موسیٰ کو کی کہ وہ چاہیں تو پہلے اپنا فن دکھائیں لیکن دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت موسیٰ نے پہلے انہی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کو پورا اعتماد تھا کہ انھیں خدا کی تائید حاصل ہے اس وجہ سے یہ ساحر کتنا ہی بڑا جادو دکھائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سحر کو باطل کر کے رہے گا۔

'سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جادو خواہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن اس سے کسی شے کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی بس دیکھنے والوں کی آنکھوں اور ان کی قوت متخیلہ پر اس کا اثر پڑتا ہے جس سے آدمی ایک شے کو اس شکل میں دیکھنے لگتا ہے جس شکل میں ساحر اس کو دکھانا چاہتا ہے۔

'اِلقَاء' کا لفظ یہاں پیش کرنے اور دکھانے کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح پانسے اور جوئے کے تیر پھینکے جاتے ہیں اسی طرح ساحر بھی کوئی چیز ناظرین کے سامنے پھینکتے ہیں اور اس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس کے لیے لفظ 'اِلقَاء' کا استعمال موزوں ہوا۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۱۱۷-۱۲۲)

سحر اور معجزہ میں ایک فرق

'لقف' کے معنی کسی چیز کو جلدی جلدی نگلنے اور 'افک یافک' کے معنی جھوٹی اور خلاف واقعہ بات کہنے یا کرنے کے ہیں۔ اوپر گزرا کہ سحر سے کسی شے کی حقیقت یا ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کا تمام تر تعلق

دیکھنے والوں کی نگاہ اور ان کی قوت متخیلہ کے تاثر سے ہوتا ہے اس وجہ سے سحر سے جو کرشمہ ظاہر ہوتا ہے وہ یکسر باطل، جھوٹ اور فریب نظر و تخیل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس معجزہ یکسر حقیقت ہوتا ہے۔ فرمایا کہ جب ساحروں نے اپنا سحر دکھایا اور اس کے اثر سے ان کی رسیاں سانپوں کی طرح رینگتی نظر آئیں تو ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ تم اپنا عصا پھینکو وہ اژدہا بن کر ان کے تمام نمائشی سانپوں سنپولیوں کو ہڑپ کر جائے گا۔

مہ نخشب اور خورشید جہاں تاب

'فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ مہ نخشب کے مقابلہ میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں مصنوعی چاند سورج ہوں جب بھی حقیقی سورج کے نکلتے ہی ان کی چمک دمک ملمع کی طرح غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰؑ کے معجزے کے ظاہر ہوتے ہی ساحروں کا سارا طلسم غائب ہو گیا۔ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ معجزہ اور سحر کا حقیقی فرق میدانِ مقابلہ میں نمایاں ہوتا ہے جب دونوں کا تصادم ہوتا ہے تو حق لازماً غالب ہوتا ہے اور باطل لازماً شکست کھاتا ہے۔

'فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ' یہ بات صرف ساحروں سے متعلق نہیں بلکہ فرعون اور اس کے تمام اعیان و انصار سے متعلق ارشاد ہوئی ہے کہ وہ میدان مقابلہ سے ذلیل و خوار ہو کر لوٹے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہ مقابلہ ایک خاص میلہ کے دن، کھلے میدان میں ہوا تھا اور فرعون کی طرف سے اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ اپنے آدمی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اکٹھے ہوں تاکہ اپنی فتح کا ڈنکا پوری دھوم سے بجایا جائے لیکن ایسی رسوائی ہوئی کہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

'وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ' ساحر حضرت موسیٰؑ کے معجزے کی قہرمانیت سے اتنے متاثر و مرعوب ہوئے کہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ مجہول کا صیغہ ان کے جذبۂ تعظیم و اکرام سے مغلوبیت کی تعبیر کے لیے ہے۔ تعظیم و اکرام کے لیے سجدہ کا رواج مصریوں، عربوں، اسرائیلیوں سب میں رہا ہے اگرچہ اکثر حالات میں اس کی جلوہ ہی ہوتی تھی جو ہمارے ہاں نماز میں رکوع کی ہوتی ہے۔

ساحر سحر اور معجزے کے فرق کو سب سے زیادہ جانتا ہے

اس سے واضح ہوا کہ سحر اور معجزے میں امتیاز کی سب سے زیادہ صلاحیت خود ساحر کے اندر ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر اعتراف حق کے لیے اخلاقی جرأت ہو۔ ساحر اپنے علم کی حقیقت اور اپنے مبلغ سے اچھی طرح آشنا ہوتا ہے اس وجہ سے جب اس کو معجزہ سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ دیکھتے ہی تاڑ جاتا ہے کہ یہ چیز اس کے فن سے ماوراء ہے۔ چنانچہ فرعون کے ان ساحروں نے بھی دیکھتے ہی اپنی بے بسی اور حضرت موسیٰؑ کی فاتحیت کا اعتراف کر لیا اور ان کی تعظیم میں سر جھکا دیے۔

ساحروں کے اندر حق پسندی کی رمق موجود تھی

'قَالُوْٓا اٰمَنَّا الاٰیۃ' ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کی تعظیم ہی پر بس نہیں کیا بلکہ صاف صاف اپنے ایمان کا اعلان بھی کر دیا اور وہ بھی اس تصریح کے ساتھ کہ ہم عالم کے رب، موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لائے، جس کے صاف معنی یہ بھی تھے کہ انھیں فرعون کی خدائی سے انکار ہے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس اعلان کا سارے مجمع پر کیا اثر پڑا ہو گا اور فرعون اور اس کے درباریوں کی کیسی رسوائی ہوئی ہو گی! یہاں یہ بات

رکھنی چاہیے کہ ہر چند یہ لوگ جادوگر تھے اور ان کے اندر اس پیشہ کی بعض خصوصیات بھی، جیساکہ اوپر معلوم ہوا، پیدا ہوگئی تھیں تاہم حق پسندی کی کچھ رمق ان کے اندر موجود تھی۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقابلہ کے لیے وہ خوش دلی سے نہیں آئے تھے بلکہ مجبور کر کے لائے گئے تھے۔ خود ان کا قول نقل ہوا ہے کہ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۷۳-طٰہٰ (ہم اپنے رب پر ایمان لائے کہ وہ ہماری خطاؤں اور اس سحر کو معاف کرے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اندازہ رکھتے ہوں کہ حضرت موسیٰؑ کوئی ساحر نہیں ہیں اور نہ انھوں نے جو چیز پیش کی ہے وہ سحر ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کے مقابلہ سے گریز کرنا چاہتے رہے ہوں لیکن فرعون اور اس کے کارندوں کے ڈر سے انھیں مجبوراً یہ کام کرنا پڑا ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر حق پسندی کی ایک روشنی دبی دبائی موجود تھی جو حضرت موسیٰؑ کے اس معجزے کی جلالت سے بھڑک اٹھی۔ سعادت کا کوئی شمہ بھی انسان کے اندر موجود ہو تو بتوفیقِ الٰہی وہ اپنا اثر دکھا ہی جاتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۲۳-۱۲۴)

فرعون ایک کائیاں سیاسی تھا

یہ بڑا ہی نازک موقع تھا۔ فرعون اور اس کے درباریوں بلکہ اس کی پوری قوم کی ہوا بالکل اکھڑ چکی تھی لیکن یہ فرعون بھی بڑا ہی کائیاں سیاسی تھا۔ اس نے بگڑتے ہوئے حالات سنبھالنے کے لیے فوراً یہ اشتلا چھوڑا کہ یہ ان ساحروں اور موسیٰؑ کی ملی بھگت ہے۔ یہ ساحر ہم کو یہاں سے بے دخل کرنے کی سازش میں موسیٰؑ کے ساتھ شریک ہیں۔ انھوں نے پہلے سے آپس میں یہ مشورت کر رکھی تھی کہ ہم عین موقع پر اپنی شکست مان کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیں گے جس سے موسیٰؑ کی دھاک سب پر بیٹھ جائے گی اور اس طرح ہم موجودہ برسرِ اقتدار گروہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نے ان پر سازش اور بغاوت کا الزام رکھ کر ان کے لیے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا جو ریاست کے باغیوں کے لیے ملک کے قانون میں موجود تھی۔ یعنی پہلے ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں پھر برسرِ عام سولی دی جائے۔

فرعون کے قول اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کی حکومت میں مذہبی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جب کہ بادشاہ خود اپنے آپ کو لوگوں کا ربِ اعلیٰ بنائے بیٹھا تھا۔ اس صورت میں تو جو بھی اس کے سوا کسی اور کو رب مانتا وہ لازماً فرعون کا باغی قرار پاتا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۚ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (۱۲۵-۱۲۶)

ایمان باللہ کا کرشمہ

ایمان باللہ کا کرشمہ دیکھیے۔ یہ وہی جادوگر ہیں جن کی دنائت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح

اپنے فن کے مظاہرہ پر بھرپور انعام کی التجا پیش کرتے ہیں یا ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی ان کے باطن کا ہر گوشہ اس طرح جگمگا اٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تاریکی کی کوئی پرچھائیں ان کے دلوں پر کبھی پڑی ہی نہیں تھی۔ اور یہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ یہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ اور پاکیزگی و تقدسیت کے ملائک صفت پیکر ہیں۔ غور کیجیے، فرعون نے کتنی بڑی دھمکی ان کو دی! لیکن انھوں نے اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ کچھ غم نہیں، اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دے دی تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور جب تیرا سارا غضب ہمارے اوپر اس جرم میں ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے تو جو کچھ تو کر سکتا ہے وہ کر گزر، اگر اس جرم کی یہ سزا ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ایمان باللہ کے نتیجہ میں انقلابِ حال

اس انقلابِ حال کے سبب پر غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ اگر انسان ایمان سے خالی ہے تو اس سے زیادہ حقیر کوئی شے نہیں اور اگر وہ ایمان سے بہرہ مند ہے تو اس سے زیادہ بلند کوئی شے نہیں۔

'رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ' یہ آگے پیش آنے والے حالات میں صبر و استقامت کی توفیق بخشے جانے کی دعا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا ہے اور فرعون نے اپنی سزا کا۔ اب ہمارا سارا بھروسا اے رب، تیرے اوپر ہے۔ تو ہمارے اوپر صبر کے دونگڑے برسا اور تمام آزمائشوں کے علی الرغم موت ایمان و اسلام پر عطا فرمایا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (۱۲۷)

فرعون کے درباریوں کی بوکھلاہٹ

اس کھلے مقابلہ میں حضرت موسیٰ کی کامیابی نے فرعون اور اس کے درباریوں کو بالکل بوکھلا دیا۔ درباریوں نے فرعون سے باصرار یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب موسیٰ اور ان کی قوم کو مزید ڈھیل دینے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اگر ان کو مزید موقع دیا گیا تو یہ آپ کو اور آپ کے بتوں کو چھوڑ بیٹھیں گے اور ملک میں بغاوت کرا دیں گے۔ فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمارا اقتدار پوری طرح ان کے اوپر مستحکم ہے۔ ہم ان کے ذکور کو قتل کرتے رہیں گے، ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہمارے قابو میں ہیں اگر ہم ان کو زور پکڑنے دینا نہ چاہیں تو یہ کیا کر سکتے ہیں۔

لڑکوں کے قتل کی سکیم

اوپر لڑکوں کے قتل اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کی ظالمانہ اسکیم کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ اسکیم اسی لیے اختیار کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کی تعداد ملک میں اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ وہ ارسٹوکریسی کے لیے خطرہ بن جائیں۔ اول اول تو یہ اسکیم دائیوں کے عدم تعاون کی وجہ سے ناکام ہو گئی لیکن فرعون اس ناکامی سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے عام لوگوں کو یہ حکم دے دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں پھینک دیا کریں۔ یہاں فرعون نے اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم بہر حال ان کو اپنے لیے خطرہ نہیں بننے دیں گے۔ اگر ضرورت

محسوس ہوئی تو ہم اسی اسکیم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلائیں گے۔

دو طرفہ خطرہ

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ فرعونی اسرائیلیوں سے اس درجہ خائف تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے کہ وہ مصر سے یک قلم نکل جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی تمام رفاہیت و خوش حالی انہی غلاموں کی رہینِ احسان تھی۔ اوپلے تھاپنے، اینٹیں بنانے سے لے کر زراعت اور تعمیرات کے سارے کام انہی کی مشقت سے انجام پاتے تھے۔ فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کا کام صرف عیش کرنا اور ان اسرائیلیوں پر حکومت کرنا اور ان سے بیگار لینا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں نہ تو فرعونیوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اسرائیلیوں کو بڑھنے اور پنپنے کا موقع دیں، نہ یہ ممکن تھا کہ ان کو یک قلم مصر سے نکل جانے دیں۔ اس دو طرفہ خطرے سے بچنے کے لیے فرعون اور اس کے لال بجھکڑوں نے یہ پالیسی بنائی کہ ان کی نرینہ اولاد کو قتل کر کے ان کی تعداد کو قابو میں رکھا جائے۔ آدمی جب اپنے حدود سے تجاوز کر کے خدائی حدود میں مداخلت شروع کر دیتا ہے تو اس کی عقل اسی طرح ماری جاتی ہے۔

فرعون کے دعوائے الوہیت کی نوعیت

’وَیَذَرَکَ وَاٰلِھَتَکَ‘ کی تاویل میں ہمارے علما اور مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ ’اٰلِھَتَکَ‘ کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے دیوی دیوتا بھی مصر میں تھے جن کی پرستش خود فرعون بھی کرتا تھا۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے رب اعلیٰ ہونے کے دعوے کی توجیہ کیا ہو گی؟ جو خود رب اعلیٰ ہونے کا مدعی ہو وہ کسی دوسرے دیوی دیوتا کو ماننے والا یا ان کی پرستش کرنے والا کیسے ہو سکتا ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فرعون اپنے زعم کے مطابق اپنے آپ کو مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا ــ سورج ــ کا اوتار سمجھتا تھا۔ اس طرح اس کی حیثیت اوتار بادشاہ (GOD KING) کی تھی۔ گویا وہ بیک وقت مصریوں کا بادشاہ بھی تھا اور ان کے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر اور اوتار ہونے کے سبب سے ان کا رب اعلیٰ بھی۔ اس نے اپنے بے شمار اسٹیچو اور بت بنوا کر اپنی مملکت میں جگہ جگہ نصب کرا دیے تھے اور اس کی رعایا ان کے درشن اور ان کے آگے ڈنڈوت کرتی تھی۔ اس طرح بادشاہ کو بیک وقت رعایا پر خدائی اور شاہی دونوں کے اختیارات حاصل تھے۔ یہاں ’اٰلِھَتَکَ‘ کے لفظ سے اس کے انہی اسٹیچوؤں اور بتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس کی ذات کی نمائندگی کرتے تھے۔ مصر کے قدیم مندروں کے جو آثار ملے ہیں ان سے بھی اسی بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ ۟ۙ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ؕ وَالْعَاقِبَۃُ
لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ
وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۲۸-۱۲۹)

تفسیر سورہ بقرہ کی فصل ۳۲ میں ہم اقامتِ دین کی جدوجہد میں صبر اور نماز کی اہمیت پر بحث کر چکے ہیں۔ در حقیقت

اس جہاد میں یہی دو چیزیں وسیلۂ ظفر ہیں۔ قرآن میں مشکلات راہ کے مقابلہ کے لیے ہر جگہ انھی دو ہتھیاروں سے مدد حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر لفظ اللہ وارد ہوا ہے لیکن اس سے مراد نماز ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ نماز ہی ہے۔ فرعون نے اس شکست سے گھبرا کر بنی اسرائیل کو دبانے اور ان کی نسل کو تباہ کرنے کا جو عزم ظاہر کیا اس سے قدرتی طور پر بنی اسرائیل کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ ان کی اسی پریشانی کو دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے ان کو نماز اور صبر کی تلقین کی۔ فتنوں اور آزمائشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے، یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور تمھیں صبر نہیں حاصل ہو سکتا مگر اللہ ہی کی مدد سے) اللہ کی یہ مدد حاصل کرنے کا واسطہ نماز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس نماز سے مراد صرف عام نماز نہیں ہے بلکہ وہ خاص نماز بھی ہے جس کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکی زندگی کے ابتدائی پرمحن دور میں کی گئی تھی۔ اسی چیز کی تاکید حضرت موسیٰ اور ہارون کو بھی کی گئی۔ سورہ یونس کی آیت ۸۷ کے تحت انشاء اللہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

اقامت دین کی جدوجہد میں وسیلۂ ظفر صبر اور نماز

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ الایہ' یہ فرعون کے اس غرور کی جو 'اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ' کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، تردید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ سے اپنے متعلق جو چاہے قاہر و مقتدر ہونے کا دعویٰ کرتا رہے لیکن زمین کا اصل مالک اللہ ہے، وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور عاقبت کی کامیابی بہر حال خدا سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ رسولوں سے متعلق اس سنت الٰہی کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو لازماً ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا فرماتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ غلبہ ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو یا ان کی زندگی کے بعد ان کے پیروؤں کو حاصل ہو اور قطع نظر اس سے کہ وہ اسی سرزمین پر قابض ہوں جس میں انھوں نے اپنی دعوت بلند کی یا اللہ تعالیٰ ان کو اس علاقے سے ہجرت کا حکم دے اور ان کی برومندی کے لیے زمین کے کسی اور خطے کا انتخاب فرمائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دشمن پر غلبہ تو ان کی زندگی ہی میں بلکہ مذکورہ بالا واقعات کے پیش آنے کے بہت تھوڑے عرصے کے بعد ہی حاصل ہو گیا لیکن ان کی امت کو حکومت عطا ہوئی فلسطین کی سرزمین کی اور یہ کام تکمیل کو پہنچا ان کی وفات کے بعد۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مصر میں بھی اس عذاب کے بعد، جو فرعون اور اس کی قوم پر آیا، وہ ارسٹوکریسی بالکل تباہ ہو گئی جو مصر پر قابض تھی اور ان کی جگہ دوسرے لوگ قابض ہو گئے جو خاندان اور روایات میں بالکل مختلف تھے اور ان کے ساتھ سابق حکمرانوں کی سیاسی رقابتیں بھی تھیں اور ان کی طرف سے یہ اندیشہ بھی فرعونیوں کو تھا کہ یہ بنی اسرائیل کے ساتھ ساز باز کر کے کہیں ملک کے حکمران نہ بن بیٹھیں۔ یہ مسئلہ چونکہ تاریخ کا ہے اور براہ راست ہم سے متعلق نہیں ہے اس وجہ سے ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

رسول کے لیے غلبہ لازمی ہے

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا الایۃ' بنی اسرائیل پر، ان کی بے یقینی اور ضعیف الاعتقادی کے سبب سے

بنی اسرائیل کی بے اعتقادی

حضرت موسیٰ کی یہ تلقین بے اثر ہی رہی۔ وہ بولے کہ ہمارے دن تو سخت سے سخت ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب حالات و واقعات یہ ہیں جو پیش آئے یا پیش آ رہے ہیں تو تمہارے ان وعدوں اور تمہاری ان طفل تسلیوں پر کون جی سکتا ہے تم تو رحمت کے بجائے ہمارے لیے زحمت ہی زحمت بنتے جا رہے ہو! اوپر تورات کے حوالے سے ہم بیان کر آئے کہ مصر پر قابض ارسٹوکریسی بنی اسرائیل کی روز افزوں تعداد سے بہت گھبرائی ہوئی تھی اور اس کی روک تھام کے لیے اس نے ان کی نسل کشی کی مہم چلا رکھی تھی۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی تنظیم و اصلاح کی دعوت لے کر اٹھے تو ارباب اقتدار کی یہ گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کو ایک طاقتور لیڈر مل گیا ہے اور اب جلد وہ ایک منظم قوت بن کر ہمارے اقتدار کو چیلنج کر دیں گے۔ اس گھبراہٹ میں فرعون نے ایک طرف تو ان کی نسل کشی کی مہم کو مزید قوت و شدت کے ساتھ چلانے کے احکام جاری کر دیئے دوسری طرف اپنے کارندوں، تحصیل داروں اور عمال کو یہ ہدایت کی کہ بنی اسرائیل سے جو بیگار لی جا رہی ہے وہ سخت سے سخت تر کر دی جائے۔ اینٹیں بنانے کے لیے جو بھس ان کو دیا جاتا رہا ہے وہ بند کر دیا جائے اور ان کو حکم دیا جائے کہ بھس بھی وہی بٹوریں اور اینٹیں بھی لازماً ہر شخص سے روزانہ اتنی ہی بنوائی جائیں جتنی اب تک وہ بناتے رہے ہیں۔ اس طرح عذاب کا وہ شکنجہ جو پہلے بھی کچھ کم سخت نہ تھا حضرت موسیٰ کے بعد اور بھی سخت ہو گیا۔ بنی اسرائیل نے یہ سب کچھ حضرت موسیٰ کے کھاتے میں ڈال دیا کہ یہ سب تمھاری برکتیں ہیں!

حضرت موسیٰ کی طرف سے تسلی

'قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ الاية' بنی اسرائیل کی مایوسی و بددلی دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے پھر ان کو تسلی دی کہ مایوس اور ہراساں نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو ہلاک کرے گا اور زمین میں تمہیں خلافت عطا فرمائے گا۔ یہاں زمین سے مراد مصر کی سرزمین نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ میں اس کی وضاحت ہوتی ہے اس سے مراد فلسطین کا علاقہ ہے۔ فرمایا وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (اور جو قوم دبا کے رکھی گئی تھی ہم نے اس کو اس سرزمین کے شرق و غرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے بڑی برکتیں رکھی تھیں، اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بسبب اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے) ظاہر ہے کہ 'بٰرَكْنَا فِيْهَا' سے جس علاقہ کی طرف اشارہ ہے وہ فلسطین ہی کا علاقہ ہے اور اس آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ اسی علاقہ کی حکومت دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ وعدہ پورا کیا جو آیت زیر بحث میں حضرت موسیٰ کی زبانی مذکور ہے

استخلاف کا اصل مقصد

'فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ' یہ استخلاف فی الارض کے اصل مقصد کی یاددہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مٹاتا اور دوسری کو عروج و اقبال بخشتا ہے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے کرتا ہے کہ اقتدار کی وراثت پا کر یہ قوم کیا رویہ اختیار کرتی ہے، یہ بھی پچھلی قوم کی طرح بدمست ہو کر زمین میں فساد مچاتی ہے یا اس خلافت و وراثت کا حق

پہچانتی اور اس کو ادا کرتی ہے۔ اگر یہ بھی اسی روش پر چل نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ایک خاص مدت تک مہلت دے کر فنا کر دیتا ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو دے کر ان کو آزماتا ہے۔ امتحان کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، برابر جاری رہے گا۔ اس وجہ سے کسی قوم کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب وہ ایک مرتبہ خدا کی محبوب بن گئی تو ہمیشہ محبوب ہی بنی رہے گی، خواہ اس کے اعمال و عقائد میں کتنی ہی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۳۰)

'سِنِیْنَ'، سنۃ کی جمع ہے۔ اس کے عام معنی تو سال کے ہیں لیکن یہ قحط اور مصیبت کے سال کے لیے بھی معروف ہے اور اسی مفہوم میں یہاں یہ استعمال ہوا ہے۔

سنتِ الٰہی کا ظہور

اوپر آیت ۹۴-۹۵ کے تحت ہم اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جب وہ اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کی دعوت کے مویدات، مختلف قسم کی آزمائشوں کی شکل میں، وہ آفاق و انفس میں بھی ظاہر فرماتا ہے تاکہ لوگوں کے کان رسول کی دعوت کے لیے کھلیں، وہ عبرت پکڑیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اسی سنتِ الٰہی کی طرف یہاں اشارہ فرمایا کہ ایک طرف موسیٰؑ نے اپنی دعوت بلند کی اور اپنے معجزات سے فرعونیوں کو جھنجھوڑا، دوسری طرف ہم نے قوم فرعون کو قحط اور پیداوار کی کمی کی آزمائشوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے اندر خدا کا خوف اور اس کی یاد بیدار ہو۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۳۱-۱۳۲)

'طیر' کا مفہوم

'تطیر' 'طیر' سے ہے۔ 'طیر' چڑیوں اور پرندوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ توہم پرستوں میں چڑیوں کے اڑنے سے فال لینے کا عام رواج ہے اس وجہ سے 'تطیر' کا لفظ فال لینے کے معنی میں استعمال ہوا۔ پھر اس کا غالب استعمال فال نحس کے معنی میں ہو گیا۔ اسی مادے سے 'طائر' کا لفظ بھی ہے جو اس چیز کے لیے استعمال ہوا جس سے کوئی نیک یا بد فال لی جائے اور پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے حظ، قسمت اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

آفات پر فرعونیوں کا ردِ عمل

اب یہ بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو آزمائشیں فرعونیوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے بھیجیں کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں انھوں نے ان کو حضرت موسیٰؑ کی نحوست کا نتیجہ قرار دیا۔ جب حالات سازگار ہوتے تو اس کو اپنی خوش بختی، بلند اقبالی اور اپنے استحقاق کی برکت قرار دیتے لیکن جب کسی ارضی و سماوی آفت سے دوچار ہوتے تو کہتے کہ یہ موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے، یہ جو بے دینی و بے عقیدگی پھیلا رہے ہیں اس سے ارضی و سماوی دیوتا ناخوش ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ ان آفتوں کی شکل میں سامنے

آرہا ہے۔ فرمایا کہ ان کا طائرِ قسمت و نحوست ہے تو خدا کے پاس اور یہ پیدا ہوا ہے ان کی اپنی ہی بداعمالیوں سے لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت سے ناواقف ہے اس وجہ سے وہ اپنی نحوست دوسروں کے طالع میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔

'وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا' یہ ان کا حتمی جواب نقل ہوا ہے کہ خواہ ہم پر جادو چلانے کے لیے تم کتنی ہی نشانیاں دکھاؤ ان چیزوں سے مرعوب ہو کر ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ قف فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ج لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۱۳۳-۱۳۵)

حضرت موسیٰ کے معجزات

اوپر آیت ۱۳۰ میں جن آزمائشوں کا ذکر ہوا ہے، یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس عام سنتِ الٰہی کے تحت ظہور میں آئیں جو ہر رسول کی دعوت کی تائید و تقویت اور لوگوں کے اندر تضرع اور تذکر پیدا کرنے کے لیے رحمتِ الٰہی کا مقتضیٰ ہیں لیکن جب فرعونی ان سے اثر پذیر نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ہاتھوں نہایت اہم معجزات دکھائے جن میں سے چند کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ ہم تورات کی روشنی میں اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

'طوفان'

'طُوْفَان'۔ تورات میں اس طوفان کی تفصیل اس طرح آئی ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملکِ مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملکِ مصر میں ہے اولے گریں اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملکِ مصر پر اولے برسائے پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملکِ مصر میں ان کو جو میدان میں تھے، کیا انسان کیا حیوان، سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا۔" خروج باب ۹ ۲۲-۲۵

اس سے معلوم ہوا کہ یہ طوفان رعد، گرج، کڑک اور اولوں کا طوفان تھا۔ بارش اور ہوائے تند بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں آگ کا جو ذکر ہے یہ تورات کے مترجموں کی غلطی ہے۔ اس سے مراد ہماری عام آگ نہیں ہے بلکہ یہ وہ بجلی ہے جو اس طرح کے طوفان کے لوازم میں سے ہے۔

ٹڈیاں

'جَرَاد'۔ جراد ٹڈی کو کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل تورات میں یوں آئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملکِ مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملکِ مصر پر آئیں اور ہر قسم کی

سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دَل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کیونکہ انھوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انھوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی ؟ خروج باب ۱۲ - ۱۵

جوئیں ‘قمل’ کے معنی ہیں جوئیں۔ یہ آفت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

" تب خداوند نے موسیٰ سے کہا، ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مارتا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی ؟ خروج ب ۱۶ - ۱۷

مینڈک ‘اَلضَّفَادِعَ’ ‘ضفادع’ ضفدع کی جمع ہے ۔ ‘ضفدع’ مینڈک کو کہتے ہیں۔ اس عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

" پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اس سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے کہ میری عبادت کریں۔ اور اگر تو ان کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آکر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا ؟ خروج ب ۱ - ۶

خون ‘دم’ کے معنی خون کے ہیں۔ اس کے ظہور کی شکل اس طرح مذکور ہے۔

’ اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے یعنی دریاؤں، اور نہروں اور جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تا کہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہو گا اور موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا

پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مرگئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ
پی سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا۔" خروج ۷: ۱۹-۲۱

'اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ' یعنی یہ تمام نشانیاں تفصیل سے مذکور ہیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'مُفَصَّلٰتٍ' کا ظرف یہاں محذوف ہے۔ یعنی ان کی تفصیل تورات میں موجود ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اسی ذیل کے چند اور معجزات بھی تمام جزئیات کی تفصیلات کے ساتھ تورات میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان کی طرف چونکہ صرف اشارہ کیا ہے اس وجہ سے ان کی تفصیلات کے لیے حوالہ تورات کا دے دیا ہے۔

'فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ' یعنی بجائے اس کے کہ ان سے ان کے اندر تضرع اور تذکر پیدا ہوتا ان کے غرور اور تکبر میں اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مجرم لوگ تھے اور اللہ تعالیٰ مجرموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ان کے لیے نشانیاں ہدایت کے بجائے صرف اتمام حجت اور قساوت قلب کا باعث بنتی ہیں۔

بار بار عہد اور بار بار عہد شکنی

'لَمَّا وَقَعَ عَلَیْهِمُ الرِّجْزُ الاٰیۃ' ۔ 'لَمَّا'، 'کُلَّمَا' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ خاص طور پر ان مواقع میں جہاں مدنظر تصویر حال ہو۔ آگے آیت ۱۸۹ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب جب وہ عذاب کی گرفت میں آتے حضرت موسیٰ کی منت سماجت کرنے لگتے کہ اس قرب و تعلق کی بنا پر جو تمھیں اپنے رب سے ہے، ہمارے لیے دعا اور سفارش کرو کہ یہ عذاب ہمارے سر سے ٹل جائے، اگر تم نے اس کو ٹال دیا تو ہم ضرور تمھاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دیں گے لیکن جب عذاب ٹل جاتا تو اپنے وعدے سے پھر جاتے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہے۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلا کر کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کر دے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا تاکہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔"

(خروج ۸: ۸)

"فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تاکہ تم خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم دور مت جانا اور میرے لیے شفاعت کرنا .... پر فرعون نے اس بار بھی اپنا دل سخت کر لیا اور ان لوگوں کو جانے نہ دیا۔" (خروج ۸: ۲۸-۳۲)

'بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ' کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ چونکہ خدا تمھاری بات سنتا اور تمھاری دعا کی حرمت قائم رکھتا ہے اس وجہ سے ہمارے لیے دعا کرو۔

'اِلٰٓی اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ' سے مقصود ان کی بے ضمیری اور ان کے سفلہ پن کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے فریب اور جھوٹ پر زیادہ دیر تک پردہ نہ پڑا رہ سکے گا وہ محض اس خیال سے جھوٹا عہد کر لیتے کہ اس سے جتنی دیر کے لیے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اٹھا لیا جائے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ
الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى
عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۥ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۶-۱۳۷)

'فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ الاٰیۃ'۔ اس انتقام سے مراد ان جرائم کا انتقام ہے جن پر پورے پورے اتمام حجت کے باوجود وہ جمے رہے۔ اللہ کی آیات سے اول تو وہ بے پروا اور غافل رہے اور جب وہ کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ ان کے سامنے ظاہر ہوئیں تو انھوں نے ان کی تکذیب کر دی کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ سحر و شعبدہ کا کرشمہ ہیں۔ اس کی پاداش میں وہ سمندر میں غرق کر دیے گئے۔ اس واقعۂ غرق کی تفصیلات کے لیے موزوں مقام ہماری اس کتاب میں آگے آئیں گے۔

بنی اسرائیل کو ان کے صبر کا صلہ

'وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ الاٰیۃ'۔ 'يُسْتَضْعَفُوْنَ' سے اشارہ ان مظالم و شدائد کی طرف ہے جو بنی اسرائیل کو دبائے رکھنے کے لیے فرعونیوں کے ہاتھوں ان پر ڈھائے گئے اور جن میں سے بعض چیزوں کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ وہی قوم جو غلامی و محکومی کے نہایت سخت شکنجوں میں کسی ہوئی تھی اللہ نے اس کو رفعت بخشی اور اس کو سرزمین فلسطین کی حکومت عطا فرمائی۔ اس حکومت بخشنے کے لیے یہاں 'ایراث' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ان کے سابق حکمرانوں کو اللہ نے وہاں سے ہٹایا اور ان کو ان کی وراثت دلائی۔ اس سرزمین کی تعریف میں 'الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' کے جو الفاظ وارد ہیں اول تو وہ یہ متعین کرتے ہیں کہ اس سے مراد فلسطین ہی کی سرزمین ہے اس لیے کہ قرآن میں اس صفت کے ساتھ اسی سرزمین کا ذکر ہوا ہے۔ دوسرے یہ الفاظ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی برکتوں کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ عربی میں 'مُبَارَكٌ' کا لفظ ان دونوں ہی مفہوموں کا حامل ہے۔

'مَشَارِقَ' اور 'مَغَارِبَ' کے الفاظ سے اس حکومت کے وسیع الاطراف ہونے کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ عربی میں بعض مرتبہ کسی لفظ کی جمع اس کے اطراف کی وسعت کے لحاظ سے بھی آتی ہے۔ پیچھے لفظ 'اعراف' پر بحث کرتے ہوئے ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ' سے اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر آیات ۱۲۸ - ۱۲۹ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے آبا و اجداد سے کیا تھا اور جس کی تجدید بالآخر موسیٰ سے فرمائی وہ وعدہ بالآخر پورا ہوا۔

'بِمَا صَبَرُوْا' سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوتے ہیں وہ بہرحال اوصاف و کردار پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ مجرد خاندان و نسب کسی کو خدا کا چہیتا بنا دے۔

قوم فرعون کی تباہی

'وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ' یعنی فرعون اور اس کی قوم کی تمام شاندار تعمیرات بھی ہم نے برباد کر دیں اور ان کے سرسبز و شاداب باغات بھی اجاڑ دیے۔ یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں 'مَا كَانَ يَصْنَعُ' اور 'مَا

'كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ'، میرے نزدیک پہلے سے تعمیرات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے سے باغات کی طرف۔ جس فرعون کا یہاں ذکر ہے اس کو تعمیرات سے خاص ذوق رہا ہے اور بنی اسرائیل زیادہ تر انھی تعمیرات کی خاطر دن رات بیگار میں جتے رہتے تھے۔ 'مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ' سے اصلاً تو انگور کے باغ مراد ہیں اس لیے کہ انھی کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، جیساکہ قرآن میں 'جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ' کی ترکیب موجود ہے، لیکن بسا اوقات کسی چیز کی تعبیر اس کے جزو غالب سے کی جاتی ہے جو باعتبار لفظ تو خاص ہوتی ہے لیکن مراد اس سے عام ہوتی ہے۔ مصر کو، کم از کم اس دور میں انگور کی پیداوار میں امتیاز حاصل رہا ہے۔ سورۂ یوسف کے بعض مقامات سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے۔

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ قوم فرعون پر غرق کے علاوہ بھی تباہی آئی جس سے ان کے شہر اور باغ سب اجڑ گئے۔ ان کے باغ تو، جیساکہ اوپر گزرا، پہلے ہی اولوں اور ٹڈیوں سے تباہ ہو چکے تھے، معلوم ہوتا ہے کوئی زلزلہ بھی اسی دوران میں آیا جس سے ان کی عمارتیں بھی منہدم ہو گئیں اور جو کچھ پچھلی آفتوں سے بچ رہا تھا وہ بھی برباد ہو گیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ (۱۳۸ - ۱۴۰)

'وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ الاٰية'۔ اس اسلوب میں جو بلاغت ہے اور بنی اسرائیل کے لیے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام و عنایت کی جو شان ہے اس کی طرف ہم بقرہ آیت ۵۰ کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

بنی اسرائیل کی سرگزشت مصر سے نکلنے کے بعد

یہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہوا جو مصر اور فرعون سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں ظاہر ہوئی ہیں اور اس نے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی جس طرح مدد فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو جس طرح ہلاک کیا وہ سب سامنے آگیا اور اس پہلو سے یہ سرگزشت ان سرگزشتوں کا تکملہ اور تتمہ بن گئی جو اس سورہ میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اب آگے بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہو رہا ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر لینے کے بعد کا ہے۔ اس حصہ سے یہ حقیقت نمایاں ہوگی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر بنی اسرائیل کی مدد کی اور ان کی رہنمائی فرمائی لیکن بنی اسرائیل نے ہر قدم پر ناشکری کی اور ٹھوکر کھائی۔

'فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ' یہاں لفظ 'قَوْمٍ' سے ان قوموں میں سے کوئی قوم مراد ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا سے نکلنے کے بعد سابقہ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر قوم بت پرست تھی۔ 'يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ' کا اسلوب بیان فی الجملہ ان کی تحقیر کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ایسے ناسمجھ اور احمق تھے کہ خدائے رحمان و رحیم کو چھوڑ کر اپنے ہی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں سے چمٹے ہوئے اور ان کی بندگی اور پوجا میں سرگرم تھے۔ لفظ 'عُكُوْف' جب 'عَلٰي' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی کسی شے پر جم جانے اور اس سے اپنے آپ کو وابستہ

کر لینے کے آتے ہیں۔

قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا، لیکن ان سے زیادہ احمق بنی اسرائیل نکلے کہ یہ تماشا دیکھتے ہی اس پر ریجھ گئے اور حضرت موسیٰ سے مطالبہ شروع کر دیا کہ جیسے دیوتا ان کے پاس ہیں ویسا ہی ایک دیوتا ہمارے لیے بھی بنا دے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی طویل غلامی نے بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی سطح اتنی پست کر دی تھی کہ خدا کے جمال و جلال کی اتنی شانیں دیکھنے کے بعد بھی وہ گویا ابھی مصر کی ظلمات ہی میں تھے۔ قدیم مالوفات سے وابستگی آسانی سے نہیں جاتی۔ شاید یہی نکتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد تمام آثار شرک یک قلم مٹا دینے کے احکام جاری فرما دیے کہ عام اور کمزور لوگوں کے لیے یہ چیزیں فتنہ نہ بن سکیں۔

بنی اسرائیل کی پہلی ٹھوکر

قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ، حضرت موسیٰ نے مطالبہ کے جواب میں فرمایا کہ تم لوگ بڑے ہی بے عقل، وہمی اور جذباتی ہو۔ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ یہ تو جو کچھ یہ کر رہے ہیں سب خدا کے ہاں بالکل برباد و پامال کر دیا جائے گا اس لیے کہ یہ یکسر باطل ہے۔ سوچو کہ اپنی ہدایت و شریعت کے لیے تمھارا انتخاب کر کے تمھیں ساری دنیا پر فضیلت و سرفرازی تو اللہ نے بخشی تو کیا اب میں اس کو چھوڑ کر تمھارے لیے کوئی اور معبود ڈھونڈنے نکلوں۔ اس سے بڑی ناشکری و ناسپاسی اور کیا ہو گی؟!!

وَاِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ ۭ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ، اس آیت کی تفسیر بقرہ میں بھی گزر چکی ہے اور اس سورہ میں بھی۔ یہاں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت سے لے کر آگے آیت ۱۴۷ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمام کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو اپنی ہدایت و شریعت سے مشرف فرمانے کے لیے کیا لیکن اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل نے یہ قدر کی کہ ادھر حضرت موسیٰ طور پر اللہ کی شریعت لینے گئے ادھر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی تمام نصیحتوں اور ان کے خلیفہ حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے علی الرغم وہی بت ڈھال کر تیار کر دیا جس کے لیے حضرت موسیٰ سے مطالبہ کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو وہ تنبیہ و ملامت فرمائی تھی جس کا ذکر اوپر گزرا۔ مقصود اس ساری تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ جو قوم آج اپنے شرف و تقدس پر اتنی نازاں ہے عین اپنے نبی کی موجودگی میں، اور اس کے عظیم معجزات کو دیکھتے ہوئے، کیا حرکتیں کر چکی ہے۔

وا من کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ!

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّاَتْمَمْنٰھَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّہٖٓ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً ۚ وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْہِ ھٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۴۲)

اس آیت کی وضاحت بقرہ کے تحت ہو چکی ہے۔ یہ اس اہتمام کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ وہ ۳۰ دن کے لیے کوہ طور کے ایک مخصوص مقام پر حاضر ہوں۔ حضرت موسیٰ، جیسا کہ آیت ۱۴۸ کے تحت بحث آئے گی، وقت مقررہ سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ہر چند حضرت موسیٰ کی یہ سبقت رضائے الٰہی کی طلب کی راہ میں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس

انبیاءؑ کی لغزش کی نوعیت

عجلت و سبقت پر گرفت فرمائی اور اس کی حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ ۳۰ دن کی مقررہ مدت بڑھا کر ۴۰ دن کر دی جائے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر یہ واضح کریں گے کہ انبیاء علیہم السلام اتباع ہوا سے مغلوب ہو کر کبھی غلطی نہیں کرتے لیکن اتباع رضائے الٰہی کے جوش میں اگر کبھی کوئی قدم ان کا حدود سے ذرا متجاوز اٹھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ان کو روک دیتا ہے اس لیے کہ وہ حق کی میزان ہوتے ہیں اور میزان کا ہر پہلو سے ٹھیک ہونا اور سو فی صدی ٹھیک ہونا ضروری ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی ہدایت حضرت ہارونؑ کو

'وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْہِ' یہ اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰؑ نے اپنی وقتی غیبت کے دوران بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے فرمایا۔ انھوں نے اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لیے حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ بنایا اور ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم قوم کے اندر کوئی خرابی، کوئی بگاڑ اور کوئی بدعت و ضلالت نہ پیدا ہونے دینا۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز رونما ہو تو اس کی اصلاح کرتے رہنا اور ہرگز ہرگز بگاڑ پیدا کرنے والوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ 'وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ' کے الفاظ سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ قوم کے اندر جو عناصر فساد تھے حضرت موسیٰؑ ان سے آگاہ تھے اور ان کی طرف سے ان کی پچھلی کارستانیوں کے سبب سے ان کو اندیشہ بھی تھا اس وجہ سے انھوں نے حضرت ہارونؑ کو خاص تاکید کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر یہ عناصر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش کریں تو اس کو چلنے نہ دینا ——— یہ ملحوظ رہے کہ یہ سارا اہتمام اس لیے بیان ہو رہا ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ بنی اسرائیل نے اسی دوران میں گوسالہ پرستی کی جو لعنت اختیار کی تو اس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۴۳)

'مِیْقَات' کے معنی وقت مقررہ کے ہیں۔ یہاں 'مِیْقَات' سے مراد وہ وقت خاص ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے خطاب و کلام سے مشرف کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔

انسان ناسوتی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھ سکتا

'قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ'۔ کلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کو شوق ہوا کہ جس کا کلام سامع نواز ہوا ہے اس کا دیدار بھی باصرہ نواز ہو۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ادب سے یہ درخواست کی کہ اے رب تو مجھے اپنے آپ کو دکھا کہ میں تجھے دیکھ لوں، یہ شوق ایک فطری شوق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اس پر ملامت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ انسان ان ناسوتی آنکھوں سے خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتا، صرف اس کی صفات کے مظاہر ہی کو دیکھ سکتا ہے۔

'وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ'۔ یہ مشاہدہ حضرت موسیٰؑ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلیٔ ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوت برداشت

محدود ہے۔ اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں لیکن یہ روشنی ایک حدِ خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے کان آواز کو سنتے ہیں لیکن ان کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے، بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لیے حیات بخش ہے جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آ کر اس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جاندار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوتِ برداشت اتنی ناتوان ہے تو وہ خدا کی ذاتِ بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نورِ مطلق اور تمام چون وچگوں سے ماوراء اور بالاتر ہے۔ فرمایا کہ تم میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، البتہ تم سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو، میں اس پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں۔ اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم سمجھنا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو، اگر نہ ٹکا رہ سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز تمھاری برداشت سے بدرجہا اولیٰ بالاتر ہے۔

'فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا'۔ دک الحائط، ھدمہ حتی سواہ بالارض۔ 'دک الارض' سوی صعودھا و ھبوطھا۔ 'دک الحائط' 'دک الارض' کے معنی ہوں گے دیوار کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا یا زمین کے تمام نشیب و فراز برابر کر دیے۔

'جبل' سے مراد یہاں پورا پہاڑ اور پورا سلسلۂ کوہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خاص حصہ یا حضرت موسیٰ کے سامنے کی کوئی مخصوص چوٹی ہے۔ کل بول کر جزو مراد لیا ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں معروف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جب پہاڑ کے مخصوص حصے پر اپنی تجلی ڈالی تو پہاڑ پاش پاش ہو کر منہدم ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہ تجلی ذات کا محض ایک پرتو اور ایک شمہ ہی رہا ہو گا لیکن پہاڑ جیسی جامد چیز بھی اس کی تاب نہ لا سکی اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

'فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' جب حضرت موسیٰ ہوش میں آئے تو بولے کہ 'سُبْحٰنَكَ' تو اس سے ارفع و منزہ ہے کہ تجھے ناسوتی آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ 'تُبْتُ اِلَيْكَ' میں نے یہ جسارت کی کہ تجھے دیکھنے کی خواہش کی۔ میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ 'وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' اور میں سب سے پہلا اس بات پر ایمان لانے والا بنتا ہوں کہ تیری ذات ہماری آنکھوں کے مشاہدے سے بالاتر ہے۔

بنی اسرائیل کی حسن پرستی کا علاج

اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر حضرت موسیٰ کو یہ سب کچھ بنی اسرائیل کی ایک شدید عقلی بیماری کو دور کرنے کے لیے دکھایا۔ تورات میں متعدد مواقع پر یہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے بار بار حضرت موسیٰ سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کیا۔ وہ کہتے کہ خدا جب تم سے بات کرتا ہے تو ہم سے بھی رو در رو ہو کر بات کرے اور ہم اس کو دیکھیں

اللہ تعالیٰ کی وہ تمام شانیں جو انھوں نے اب تک دیکھی تھیں وہ ان کے دلوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہوئیں۔ ایک ان دیکھے خدا پر کسی طرح ان کا دل جمتا ہی نہ تھا۔ اور اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ کا جو مطالبہ ان کی طرف سے مذکور ہے وہ بھی ان کی اسی خواہش کا مظہر ہے کہ وہ خدا کو ایک پیکرِ محسوس میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اس محسوس پرستی کی بیماری کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت موسیٰؑ کو واضح طور پر بتا اور دکھا دیا کہ خدا آنکھوں سے دیکھنے اور ہاتھوں سے چھونے کی چیز نہیں ہے، صرف عقل سے سمجھنے اور دل سے ماننے کی چیز ہے۔ آنکھیں صرف اس کی صفات کے جلوے دیکھ سکتی ہیں۔ اس سے آگے ان کی رسائی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ ساری باتیں بنی اسرائیل کو سمجھائیں لیکن یہ کھٹک ان کے دلوں سے گئی نہیں چنانچہ اس کی وجہ سے وہ خدا کے عتاب میں بھی آئے جس کا ذکر بقرہ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔

اس مقام سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جن جوگیوں اور صوفیوں نے مشاہدہ ذاتِ الٰہی کو معرفت کا درجۂ کمال قرار دیا ہے اور اس کو اپنا نصب العین بنایا ہے انھوں نے اپنا گول اپنی رسائی کے حدود سے بہت آگے بڑھ کر باندھا ہے اور اس کا حاصل خیرگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ مگس شہباز کے شکار کے لیے نکلے۔ ہم سورۂ نجم کی تفسیر میں انشاء اللہ بتائیں گے کہ اوروں کا کیا ذکر سب سے زیادہ عالی مقام اور صاحب قرب حضرت جبریل ہیں لیکن ان کی رسائی کی بھی ایک حد مقرر ہے، وہیں سے وہ انوار و تجلیات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، اگر ذرا اس سے آگے قدم بڑھائیں تو

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

جو بخشا گیا اسی پر قناعت کرو

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے پیغام اور اپنے کلام سے تم کو لوگوں پر جو برگزیدگی بخشی ہے تمھارے شرف کے لیے بھی بس ہے، میں نے جو تعلیم و ہدایت تمھیں عطا فرمائی ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور برابر میرے شکر گزار رہو۔ یعنی اس کا حق ادا کرو، خود بھی دل و جان سے اس کی قدر کرو، دوسروں کو بھی یہ بتاؤ اور سکھاؤ۔ انداز کلام سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقہ سے نکلتی ہے کہ جو عطا ہوا ہے تمھارے لیے یہی بہت ہے اس پر قناعت کرو۔ میرے دیدار کی خواہش نہ کرو۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ (۱۴۵)

الواح سے متعلق تورات کی دو مختلف روایتیں

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ۔ تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا، تورات سے دونوں باتیں نکلتی ہیں۔

"اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں۔" (خروج باب ۲۴: ۳-۴)

دوسرے مقام میں اس طرح ہے۔

"اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا وہ بھی خدا ہی کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا" خروج باب ۳۲: ۱۵-۱۶

قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کو محتمل ہیں اور اصلاً دونوں میں کوئی فرق ہے بھی نہیں۔ جب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ تعالیٰ ہی نے لکھا۔ ایک پل کی تعمیر ایک انجینیر کرتا ہے لیکن بادشاہ یا حکومت کے حکم اور اس کے منصوبہ اور نقشہ کے تحت کرتا ہے۔ اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ بادشاہ یا حکومت نے پل بنایا۔ قرآن کی حفاظت کا تمام اہتمام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے ہاتھوں عمل میں آیا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عمل میں آیا اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ 'وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ' اور ہم ہی ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

بنی اسرائیل کے لیے تعلیم بالقلم کا اہتمام

یہ الفاظ اس اہتمام و عنایت خاص کو ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے معاملے میں فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے انھوں نے اپنی اپنی امتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کا اہتمام فرمایا۔ ان کے پیغمبر نے صرف قول و عمل ہی سے ان کو نہیں بتایا اور سکھایا بلکہ ان کے لیے سب کچھ قلم بند بھی کر دیا کہ اللہ کی شریعت ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے لیکن اس اہتمام کی جو قدر انھوں نے کی اس کی تفصیلات بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں۔

الواح میں مندرج تفصیلات کی نوعیت

'مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ' یعنی ان الواح میں ہر قسم کی ضروری ہدایات بھی تھیں اور تمام ضروری تفصیلات بھی۔ 'مِنْ كُلِّ شَيْءٍ' اور 'لِكُلِّ شَيْءٍ' اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس کا تعلق پیش نظر مقصد و موضوع ہی سے ہوتا ہے۔ یعنی اس مرحلہ میں دین و شریعت کی جو باتیں بتانی مدنظر تھیں وہ ساری باتیں بھی بتائی گئیں اور جماعتی تنظیم و تشکیل سے متعلق جو تفصیلات درکار تھیں وہ بھی درج الواح ہوئیں۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ الواح میں صرف مشہور احکام عشرہ ہی درج ہوئے لیکن یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوپر ہم نے کتاب خروج سے جو حوالے نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تختیاں دو تھیں اور دونوں اپنے دونوں جانب سے بھری ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں تورات کے مذکورہ مقام پر بہت سی دوسری تفصیلات بھی ہیں جو جماعتی تنظیم و تشکیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اس مرحلہ میں بنی اسرائیل

کو ان سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے تورات کی طرح صرف دو ہی تختیوں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اَلْوَاح کا لفظ استعمال کیا ہے جو جمع کے لیے آتا ہے اور عربی میں جمع کا اطلاق دو سے زیادہ پر ہوتا ہے۔

صیغۂ تفضیل کا ایک خاص محل

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا، اس کو مضبوطی سے پکڑو یعنی پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو اختیار کرو اور ہر طرح کے حالات میں، خواہ نرم ہوں یا سخت، اس کی ہدایات پر جمے رہو اور اپنی قوم کو بھی ہدایت کرو کہ دوسری جاہل قوموں کی ریس میں ان کے جیسے بتوں کی فرمائش نہ کرے اور نہ ان کے طور طریقے اختیار کرے بلکہ اس سے بہتر طریقے کو اپنائے جو اس نوشتہ میں بتایا گیا ہے۔ بِاَحْسَنِهَا میں جو تقابل و تفاضل ہے وہ نوشتۂ الواح کی مختلف ہدایات میں نہیں ہے اس لیے کہ وہ تو ساری کی ساری احسن ہی تھیں اور سب بلا استثناء انتخاب اختیار کرنے کے لیے ہی تھیں بلکہ یہ ترجیح مشرک قوموں کے اس طور طریقے کے مقابل میں ہے جن سے بنی اسرائیل کو دریا پار کرنے کے بعد سابقہ پیش آیا اور جن سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے وہ مطالبہ پیش کر دیا جس کا ذکر اوپر آیت ۱۳۸ میں گزرا۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ ریجھیں بلکہ اس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقہ کو اپنائیں جو ان الواح میں ان کو بتایا گیا ہے۔ تفضیل کا صیغہ اس مفہوم کے لیے قرآن میں بعض دوسرے مواقع میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ زمر آیت ۵۵ میں۔ ان شاء اللہ کسی موزوں مقام میں ہم اس کی مزید تفصیل بیان کریں گے۔

آگے کے مراحل کے لیے بدرقہ

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ یہ آگے کے مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ان تعلیمات و ہدایات کو مضبوطی سے پکڑنا تمھارے اور تمھاری قوم کے لیے، اس واسطے بھی ضروری ہے کہ آگے تمھیں کفار و فساق کے علاقوں سے گزرنا اور ان سے سابقہ پیش آنا ہے۔ کفر و فساد کے ان علاقوں میں یہی چیزیں تمھارے لیے بدرقہ اور زادِ راہ کا کام دیں گی اور انھی کے ذریعہ سے تم غالب اور فتح مند رہو گے۔ ان سے مسلح رہے بغیر تمھاری قوم کے لیے ہر قدم پر فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۴۶-۱۴۷)

ایک برسرِ موقع تنبیہ

یہ برسرِ موقع ایک جامع تنبیہ و تذکیر ہے کہ کون لوگ ان تعلیمات کی قدر کریں گے، ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون ان سے منہ موڑیں گے اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی محرومی سے دوچار ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی زمین میں رہتے بستے اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز، اس کے امر و حکم سے اپنے آپ کو بالاتر، اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنا استحقاقِ ذاتی سمجھیں گے، اللہ ان کو ان ہدایات کی طرف مائل ہونے کی توفیق نہیں دے گا

ایسے لوگوں کے اندر خیر اور ہدایت کی رغبت مردہ ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کو ہدایت کی راہ دکھائی جائے تو وہ اس سے بھاگتے ہیں اور اگر گمراہی کی راہ کی دعوت دی جائے تو اس پر فوراً چل پڑتے ہیں۔ ان کی یہ حالت نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ وہ خدا کی نشانیوں سے بے پروا زندگی گزارتے ہیں اور واضح سے واضح بات بھی ان کے سامنے آئے تو اس کو جھٹلا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اللہ کی آیات اور آخرت کی ملاقات کے جھٹلانے والے ہیں، ان کے سارے اعمال اکارت اور بے ثمر ہو کے رہ جائیں گے۔ آخرت میں صرف اس عمل کی قدر و قیمت ہے جو خدا کی رضا کے لیے آخرت کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِیْنَ (۱۴۸)

اس سارے اہتمام کی بنی اسرائیل کی طرف سے قدردانی

یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کی ہدایت کے لیے یہ کچھ جتن کیے جو مذکور ہوئے لیکن انھوں نے اس کی قدر یہ کی کہ حضرت موسیٰؑ کے جانے کے بعد ایک بچھڑے کی مورت بنا کر اس کی پوجا پاٹ میں لگ گئے۔

'مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ' اس مورت کو بنانے کے لیے تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے سونے کے زیورات چندہ میں دیے، انھی زیورات سے بچھڑے کی ایک مورت بنائی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ صنعت گری یہ کی گئی کہ اس میں سے جب ہوا گزرتی تو جس طرح بچھڑے ڈکرتے ہیں اس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی۔ 'خُوَارٌ' عربی میں بیل کے ڈکرنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

قرآن نے یہ ساری تصریح بنی اسرائیل کی بلادت، عقلی بے مایگی اور ساتھ ہی ان کی ناقدری و ناسپاسی ظاہر کرنے کے لیے کی ہے کہ جس خدا نے بے ہمتا و بے مثال نے ان کو اپنے جلال و جمال کی وہ شانیں دکھائیں جو اوپر مذکور ہوئیں اس کی قدر انھوں نے یہ کی کہ اپنے ہی زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا، بچھڑا بھی کوئی سچ مچ کا نہیں بلکہ صرف ایک جسد، ایک قالب، ایک دھڑ، جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی اور اس کے متعلق یہ باور کر لیا کہ یہی وہ خداوند خدا ہے جو بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر لایا اور یہی اپنی رہنمائی میں بنی اسرائیل کو ارض موعود کی بادشاہی دلائے گا!! اس طرح انھوں نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے ان کے طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰؑ نے ان کو ڈانٹ بتائی تھی۔

سامری/ فن

تورات والوں نے تو یہ سارا فتنہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن قرآن نے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اس کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے اور اس سارے فساد کا ذمہ دار، جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں آئے گا، سامری کو قرار دیا ہے جو بڑا ہی شاطر اور ریاکار منافق تھا اور محض اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے حضرت موسیٰؑ کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو مصر وغیرہ کی بت پرستی اور صنعت گری سے واقف ہو ایک ایسا بچھڑا ڈھال لینا کچھ مشکل نہ تھا جس میں سے بھاں بھاں کی آواز نکلے۔ مندروں کے پجاریوں

اور پروہتوں نے عوام فریبی کے لیے ہر دور میں، ایسے ایسے عجائب اور کمالات دکھائے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس سے بھی کہیں زیادہ عجیب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں بت پرستی ہو قدرتی طور پر وہاں بت گری کا فن بھی بہت ترقی کر جاتا ہے۔ مصر کے اسوان بند کی تعمیر کے سلسلہ میں ابوسمبل کا قدیم اور عظیم مندر جو بین الاقوامی اہتمام میں اپنی جگہ سے منتقل کیا گیا ہے، ایک انگریزی مجلے میں اس کی تفصیلات کے مطالعے کا مجھے موقع ملا۔ میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ مندر میں بادشاہ (فرعون) اور ملکہ کے اسٹیچو ایسے زاویے سے نصب کیے گئے تھے کہ سال میں جو تاریخ بادشاہ کی ولادت کی ہوتی اس دن سورج کی پہلی کرنیں بادشاہ کی پیشانی پر پڑتیں۔ اب غور کیجیے کہ جو بادشاہ سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا ہو عوام کالانعام کے دلوں میں اس کی خدائی کا سکہ جمانے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوسکتی تھی؟

الغرض سامری کے لیے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس طرح کا کوئی بچھڑا بنا لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، جس سے بچھڑے کی سی آواز نکلے لیکن اس نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عوام فریبی کے لیے اس نے ایک مکاشفہ اور ایک خاص کرامت کا بھی ڈھونگ رچایا جس سے اس کا رنگ عوام پر خوب جم گیا۔ یہاں اشارے پر کفایت کیجیے، سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

معبود کی ضرورت — 'اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا' یہ بات کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ ذرا نہ سوچا کہ جو نہ بات کر سکتا نہ رہنمائی کر سکتا آخر وہ کس مرض کی دوا ہے کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے۔ معبود کوئی کھلونا نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی کی سب سے بڑی ضرورت وابستہ ہے کہ وہ رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے ایک چیز کا وجود بے معنی ہے تو اس کو معبود کیوں مانیے اور اس کی عبادت کیوں کیجیے۔

'اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِیْنَ' یہ اصل بات کا حصہ ہے۔ یعنی وہ بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۱۴۹)

بعد از وقت تنبہ — 'سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ' عربی زبان کا محاورہ ہے جس کے معنی عام طور پر نادم اور خجل ہونے کے کیے گئے ہیں لیکن ندامت و خجالت کا لازم چونکہ غلطی پر متنبہ ہونا بھی ہے اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ متنبہ ہونا کیا جائے تو میرے نزدیک غلط نہ ہوگا۔ اس محاورے کی اصل کیا ہے؟ اس بارے میں اہل لغت کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف قدرتی نتیجہ ہے اس بات کا کہ ہر محاورے کی اصل کی تحقیق ہے بڑا مشکل کام۔ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ کس چیز کا ہاتھ میں گرایا جانا گویا اس کا سامنے آجانا ہے ایسی حالت میں ایک غبی بھی اس پر متنبہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ہاتھ کنگن کے لیے آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر یہ توجیہ صحیح مان لی جائے تو مطلب یہ ہوا کہ سامری اور

اس کے ساتھیوں کے پروپگنڈے سے مسحور ہو کر بنی اسرائیل یہ حماقت کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن سامنے جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا نظر آیا اور معلوم ہوا کہ یہ بنی اسرائیل کا خدا برآمد ہوا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ان کو اپنی حماقت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور بولے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم تو نامراد ہوئے۔

قرینہ دلیل ہے کہ یہ احساس ان لوگوں کو ہوا جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ موجود تھی۔ عوامی جوش کے بحران میں تو وہ صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جب نتیجہ سامنے آگیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ یہ تو معاملہ بہت ہی خراب ہو گیا ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس طرح کے مواقع بڑی ہی آزمائش کے اور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ کوئی ایک شیطان اُٹھتا ہے اور جذباتی عوام کی بھیڑ اپنے ارد گرد جمع کر کے کوئی ایسا فتنہ اٹھا دیتا ہے جس سے پوری جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور بسا اوقات سمجھ دار اور ذمہ دار لوگ بھی اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوْمِهِۦ غَضْبَـٰنَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِى مِنۢ بَعْدِىٓ ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى ٱلْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُۥٓ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ٱبْنَ أُمَّ إِنَّ ٱلْقَوْمَ ٱسْتَضْعَفُونِى وَكَادُوا۟ يَقْتُلُونَنِى فَلَا تُشْمِتْ بِىَ ٱلْأَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِى مَعَ ٱلْقَوْمِ ٱلظَّـٰلِمِينَ ۝ قَالَ رَبِّ ٱغْفِرْ لِى وَلِأَخِى وَأَدْخِلْنَا فِى رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ ۝ (۱۵۰-۱۵۱)

حضرت موسیٰؑ پر حمیتِ حق کا غلبہ

تورات اور قرآن دونوں ہی سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پہاڑ ہی پر اس حادثہ کی اطلاع مل چکی تھی بلکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ ہی نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھی چنانچہ جب وہ پلٹے ہیں تو نہایت غصہ اور غم و افسوس کی حالت میں پلٹے ہیں۔ غصہ ان کو مفسدین کی اس کامیاب شرارت پر تھا اور غم و افسوس اپنی قوم کی نادانی و جہالت پر۔ آتے ہی انھوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جن پر ان کی غیر موجودگی میں قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی کہ قوم کو اس برے راستے پر ڈالا یا جانے دیا۔

'اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ' یعنی قبل اس کے خدا یہ بتائے کہ اس کی عبادت کا کیا طریقہ ہے کیا! اور یہی بتانے کے لیے اس نے مجھے پہاڑ پر بلایا) تم نے سبقت کر کے خود عبادت کا ایک طریقہ ایجاد کر لیا حالانکہ یہ چیز تمھارے ایجاد کرنے کی نہیں بلکہ خدا ہی کے بتانے کی تھی۔ استفہام یہاں سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ بت پرستی دراصل عقیدۂ حلول کے تحت وجود میں آئی ہے۔ مشرکین سمجھتے ہیں کہ خدا ان صورتوں اور مورتوں میں حلول کر جاتا ہے اس وجہ سے ان کی عبادت خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ آگے اسی سورہ میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث آئے گی۔

'وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ' یہ ان کے غلبۂ حال اور جوشِ حمیت کی تصویر ہے کہ تختیاں تو انھوں نے

ایک طرف ڈال دیں اور حضرت ہارونؑ کا سر اور شانہ پکڑ کر ان کو جھنجھوڑنے لگے، مطلب یہ کہ یہ کیا ہوا؟ تم نے اس فتنہ کو کیوں سر اٹھانے دیا؟ چونکہ اصل ذمہ داری حضرت ہارونؑ ہی پر تھی اور ان پر پورا پورا اعتماد بھی تھا اس وجہ سے وہ سب سے زیادہ عتاب کی زد میں آئے۔ اللہ کے معاملے میں یہ جوش و جذبہ غیرتِ ایمانی کا بھی تقاضا ہے اور حضرت ہارونؑ کے ساتھ قلبی محبت کا بھی۔

حضرت ہارونؑ کی طرف سے صفائی

'قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ' یہ حضرت ہارونؑ نے اپنی صفائی پیش فرمائی ہے اور اندازِ خطاب بہت پیارا ہے۔ 'یَا اَخِیْ' نہیں کہا بلکہ 'ابن امّ' اے میرے ماں جائے، کہا جس سے شفقت اور استمالت دونوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ نے صفائی میں فرمایا کہ قوم نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں۔ اس سے واضح ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس فتنہ سے لوگوں کو روکا بلکہ اس کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی لیکن قوم کی بھاری اکثریت سامری کے چکمے میں آگئی اور خود ان کے ساتھ اتنی قلیل تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے ان کے لیے اس کو روکنا ممکن نہیں رہا۔ اس وجہ سے انھوں نے، جیسا کہ دوسری جگہ بیان آئے گا، مصلحت اسی میں دیکھی کہ حضرت موسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کریں کہ مبادا ان کا کوئی اقدام کسی مزید مضرت کا باعث ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے۔ 'اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ طٰہٰ' (میں ڈرا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا)

'فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ الآیۃ' یعنی دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے ان ظالموں میں شمار نہ کر، یہ سارا فتنہ شریروں کا اٹھایا ہوا ہے، میں اس سے بالکل بری ہوں لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ سارا عتاب مجھ پر ہوا تو وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوں گے کہ فتنہ تو انھوں نے اٹھایا اور ذمہ داری ساری مجھ پر آئی۔

حضرت ہارونؑ پر مرتبین تورات کے جھوٹ کی تردید

اس سے مرتبین تورات کے اس جھوٹ کی پوری پوری تردید ہو گئی جو انھوں نے حضرت ہارونؑ پر لگایا ہے کہ گوسالہ سازی کا یہ سارا کام حضرت ہارونؑ کے اہتمام میں انجام پایا۔ قرآن نے نہ صرف حضرت ہارونؑ کو اس ذلیل تہمت سے بری کیا بلکہ اس فتنہ کے اصل بانی کی بھی نشان دہی کی اور اس کے اس سارے ڈھونگ کو بھی بے نقاب کیا جو عوام فریبی کے لیے اس نے رچایا۔ اس کے موقع پر اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ آئے گی۔

'قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ الآیۃ' حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے اس عذر کو قبول کر لیا۔ حضرت ہارونؑ پر یہ شبہ تو کسی طرح ہو سکتا ہی نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اس فتنہ کے بانیوں میں ہوں گے البتہ یہ شبہ حضرت موسیٰؑ کو ہوا ہو گا کہ انھوں نے اس کے روکنے کے لیے اپنی ذمہ داری کما حقہٗ ادا نہیں کی۔ حضرت ہارونؑ کے مذکورہ بالا جواب سے یہ شبہ دور ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنا سر دے کر بھی اس فتنہ کو روک نہیں سکتے تھے تو ان کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس سے اپنے آپ کو الگ رکھیں اور حضرت موسیٰؑ کا انتظار کریں۔ صورتِ معاملہ واضح ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگی اور پہلے اپنے لیے مغفرت مانگی اس لیے کہ دعائے مغفرت میں صحیح ادب یہی ہے اور اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے

کہ حمیت حق کے جوش میں بھائی کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ؕ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِھَا وَاٰمَنُوْٓا ۫ اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِھَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۵۲-۱۵۳)

گوسالہ پرستوں پر غضب الٰہی

یہ وہ وعید ہے جو اس موقع پر بنی اسرائیل کو سنائی گئی کہ جن لوگوں نے یہ گوسالہ سازی کی ہے ان پر آخرت سے پہلے دنیا کی زندگی میں بھی خدا کا غضب اور ذلت کی مار ہوگی، اس لیے کہ یہ اللہ پر افترا کیا گیا ہے اور اللہ پر افترا کی سزا یہی ہے۔ البتہ جو لوگ توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کر لیں گے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب جس شکل میں ظاہر ہوا اس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۵۴ کے تحت ہم پیش کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے ہر قبیلہ کے مومنین مخلصین کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے ان مجرمین کو قتل کر دیں جو فتنہ میں شریک رہے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ صرف وہ لوگ قتل سے بچے جنھوں نے توبہ کر لی۔ شرک کو اللہ پر افترا قرار دینے کی وجہ دوسری جگہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہاں توبہ کے ساتھ ایمان کی شرط مذکور ہے۔ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِھَا وَاٰمَنُوْٓا اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن سے آدمی کا ایمان ہی سلب ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ گناہ انہی گناہوں میں سے تھا اس وجہ سے توبہ کے ساتھ تجدید ایمان کی شرط لگائی گئی۔ اگر گناہ کی نوعیت یہ نہ ہو تو توبہ کے ساتھ رہیے کی اصلاح توبہ کو مکمل کر دیتی ہے۔

وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَفِیْ نُسْخَتِھَا ھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلَّذِیْنَ ھُمْ لِرَبِّھِمْ یَرْھَبُوْنَ (۱۵۴)

'سَکَتَ' کے بعد 'عن' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'ذال' یا اس کے کسی ہم معنی لفظ کے مفہوم پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ خاموش ہوئے اور ان کا غصہ دور ہوا۔

تورات کی ایک غلط روایت کی تردید

'اَخَذَ الْاَلْوَاحَ' انھوں نے وہ تختیاں، جو ایک طرف ڈال دی تھیں، پھر اٹھا لیں۔ اس سے ضمناً تورات کی اس غلط روایت کی تردید ہو گئی کہ تختیاں پھینکنے سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ یہ واضح رہے کہ ان تختیوں کو اس طرح ڈال دینے میں ان کی ناقدری کا کوئی پہلو نہیں تھا بلکہ بنی اسرائیل نے اس نعمت گراں مایہ کی جو ناقدری کی تھی اس پر اظہار غم و غصہ تھا کہ تمہارے رب نے تو تمہارے لیے یہ توقیع سیادت و امامت بھیجا اور تم ہو کہ تم نے اس طرح اپنی ناک کٹوائی۔

'وَفِیْ نُسْخَتِھَا ھُدًی وَّرَحْمَۃٌ'۔ 'نُسْخَۃ' کسی تحریر کی حرف حرف نقل کو بھی کہتے ہیں۔ اصل تورات چونکہ انہی الواح کی نقل تھی اس وجہ سے تورات کو ان کے نسخہ سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اس میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈریں۔ یہ دوسرے لفظوں میں وہی بات ہے جو قرآن سے متعلق 'ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ہدایت و رحمت سے متعلق ہم دوسرے مقام میں عرض کر چکے ہیں کہ جب یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آئیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آغاز کے لحاظ سے ہدایت اور انجام کے لحاظ سے رحمت۔ دنیا کی زندگی میں یہ

رہنما ہوگی اور آخرت میں خدا کی رحمت کا وسیلہ۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ
مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ
مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً
وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۵۵-۱۵۶)

کوہِ سینا پر حاضری توبہ کے لیے تھی

یہ حضرت موسیٰؑ کے دوبارہ کوہِ سینا پر جانے کا ذکر ہے جب وہ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد توبہ کے لیے گئے ہیں۔ تورات کے راویوں نے اس واقعہ کو پہلے واقعہ کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے بات گھپلا ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن نے ان دونوں واقعات کو الگ الگ بیان کیا ہے اس لیے کہ یہ واقعہ بجائے خود بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھنے والا واقعہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص وقت مقرر کیا اور حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب فرمائے تاکہ جس نوعیت کا اجتماعی جرم صادر ہوا ہے اسی نوعیت کی اجتماعی توبہ بھی ہو۔ نیز جو کچھ پیش آئے وہ قوم کے تمام ممتاز آدمیوں کے سامنے پیش آئے کہ وہ قوم کے سامنے اس کی گواہی دیں۔

'فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنا جلال ظاہر فرمایا تاکہ بنی اسرائیل کے لیڈروں کو پھر یاددہانی ہو جائے کہ جس خداوند کے ساتھ ان کا معاملہ ہے اس کے جلال و جبروت کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے۔ تورات میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

"جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے ...... اور کوہِ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا ..... اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا" خروج باب ۱۹ - ۱۸-۱۹

اگرچہ تورات میں یہ ذکر اس موقع کا ہے جب بنی اسرائیل کو مشہور احکام عشرہ دیے گئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہی صورت حال اس توبہ کے موقع پر بھی پیش آئی ہے جس کا ذکر قرآن نے 'اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ' سے کیا ہے۔

'قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ' اب یہ حضرت موسیٰؑ کی گریہ وزاری اور ان کی دعا و فریاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ہمارے ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے تو یہ کام تو اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر دیتا لیکن اب جب کہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کرے۔

'اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ' مطلب یہ کہ یہ جو کچھ ہوا جماعت کے اندر کے نادانوں کی بدبختی سے ہوا اور یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو نادانوں کے کسی جرم کی پاداش میں سب کو ہلاک کر دے۔

'اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ الاٰیۃ' مطلب یہ کہ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی اور تیری آزمائش سے عہدہ برآ ہونا ہی

خدا کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونا آسان بازی نہیں ہے

ہوتے ہیں جن کو تیری توفیق حاصل ہو۔ تو ہی جن کو توفیق بخشتا ہے تیرے امتحان میں کامیاب ہوتے اور ہدایت پاتے ہیں، اور جن کو اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ نے اسی سنت اللہ کا حوالہ دیا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کا ذکر بار بار قرآن میں ہو چکا ہے لیکن ساتھ ہی نہایت ہی ادب کے ساتھ اور نہایت ہی لطیف طریقہ پر اس میں معاملے کی نزاکت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ تیرے امتحانوں میں پورا اترنا کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ تیرے فضل اور تیری توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔ تو ہی ہمارا ولی اور کارساز ہے تو ہمیں بخش، ہم پر رحم فرما تو بہترین بخشنے والا ہے۔

'وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً الاٰيۃ' اس دُنیا میں بھی تو ہمارے لیے بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی بھلائی لکھ دے۔ آخرت کے ساتھ لفظ 'حَسَنَةً' کو حذف کر دیا اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل ہے۔ لفظ 'هُدْنَا' پر دوسری جگہ ہم بحث کر چکے ہیں۔ اس کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہود کے لیے ایک لطیف یاد دہانی بھی ہے کہ اگر ان میں کچھ حیا ہے تو اپنے نام کی لاج رکھیں۔

خدا کی رحمت اور نقمت کا ضابطہ

'قَالَ عَذَابِيْ أُصِيْبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ الاٰیۃ' حضرت موسیٰؑ کی دعا مطلق تھی اور قوم کے ساتھ ان کو جو محبت تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی تعمیم کے ساتھ قوم کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی دعا مانگیں۔ تورات میں بھی اس موقع کی دعا اسی تعمیم کے ساتھ مذکور ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اپنے عذاب و رحمت کا اصل ضابطہ بیان فرما دیا۔ فرمایا کہ جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں انھی پر نازل کرتا ہوں جن پر چاہتا ہوں۔ 'جن پر چاہتا ہوں' کا مطلب بار بار ہم واضح کر چکے ہیں کہ خدا کا ہر چاہنا اس کی حکمت اور اس کے عدل کے تحت ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں اپنا عذاب صرف ان پر نازل کرتا ہوں جو میرے قانونِ عدل کے تحت اس کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ رہی میری رحمت تو وہ اس دُنیا میں تو ہر چیز کو عام ہے، جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے میرے ہی فضل سے ملی ہے، جس کو بھی رزق پہنچ رہا ہے میرے ہی خوانِ کرم سے پہنچ رہا ہے، امیر و غریب، شاہ و گدا اور کافر و مومن جس کے پاس بھی جو کچھ ہے سب میرا ہی عطا کردہ ہے لیکن وہ رحمت جو آخرت سے متعلق ہے اس کو میں ان لوگوں کے لیے خاص رکھوں گا جو اس دنیا کی زندگی میں مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور خاص کر ان کے لیے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

ایک توجہ طلب ٹکڑا

'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' کا ٹکڑا یہاں خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ 'يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا' بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا 'وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ' اسلوب کی اس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آیندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا اور جس کی وضاحت مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ
بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ
سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ
بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ
السَّبِیْلِ ۱۲ - مائدہ

اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز
کا اہتمام قائم رکھو گے، زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے
رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی تائید کرو گے اور
اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے۔ اگر تم یہ کرو گے تو میں تمہارے
گناہ تم سے دور کردوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں
داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ پس جو
اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ
سے بھٹک گیا۔

یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں اور رسولوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰ کے بعد آئے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی امی کی طرف تھا جس کی بعثت کی پیشین گوئی خود سیدنا موسیٰ نے، جیسا کہ بقرہ میں گزر چکا ہے، بڑی تصریح کے ساتھ فرمائی تھی۔ آل عمران میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ
اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ
لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ
ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ
اِصْرِیْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ؁
۸۱ - اٰل عمران

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے نبیوں کے باب میں
میثاق لیا کہ ہم نے تم کو کتاب اور حکمت سے نوازا،
پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول تصدیق کرتا ہوا ان
پیشین گوئیوں کی جو تمہارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان
لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ پوچھا کیا تم اس کا اقرار
کرتے ہو اور اس باب میں میری سونپی ہوئی ذمہ داری اٹھاتے
ہو؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہو، میں
بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

یہی عہد و میثاق ہے جس کی طرف وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ کی درخواست کے جواب میں یہ تصریح فرما دی کہ میری ابدی اخروی رحمت کے سزاوار صرف وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد شریعت پر قائم رہیں گے، آگے آنے والے نبیوں اور رسولوں کی تائید کریں گے اور ان میں سے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے مددگار و خدمت گزار بنیں گے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو قرآن نے بر سبیل تضمین و تفسیر وضاحت فرما دی کہ آج اس وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ کے مصداق کون لوگ ہوں گے۔ فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ز
یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ
اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷)

ایک ابہام کی وضاحت

یعنی وہ لوگ جو اس نبی امی کی پیروی کریں جس کی پیشین گوئیاں خود ان کی اپنی کتابوں، تورات و انجیل میں موجود ہیں۔ نبی امی سے مراد ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول، نبی، امّی، یہ تینوں الفاظ یہاں آپ کی تعریف اور تعارف کے طور پر وارد ہوئے ہیں۔ نبی اور رسول کے فرق کی طرف مختلف مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ رسول اپنی قوم کے لیے کامل حجت اور کامل عدالت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے قوم پر اللہ کی حجت پوری کر دی جاتی ہے اس وجہ سے اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی تو لازماً تباہ کر دی جاتی ہے اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو لازماً مخالفین پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، عام اس سے کہ یہ نبی کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی وفات کے بعد۔ نبی کے لیے ان خصوصیات کا حامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس پہلو سے ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔

بنی اسمٰعیل کے لیے اُمّیین کا لقب

لفظ 'امّی' پر ہم آل عمران کی آیت ۲۰ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہ لفظ بنی اسمٰعیلؑ کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ بنی اسمٰعیل چونکہ تعلیم و تعلم اور کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ تھے، اس پورے دور میں جو ان کے بزرگ خاندان حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد گزرا ان کے ہاں کسی نبی یا رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی جب کہ اسی دوران میں بنی اسرائیل کے اندر بے شمار نبی پیدا ہوئے جن میں سے حضرت موسٰیؑ اور حضرت مسیحؑ نبی اور رسول دونوں حیثیات کے جامع تھے۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل بنی اسمٰعیل کو 'امیین' کہتے تھے۔ اگرچہ بنی اسرائیل اس لفظ کو بنی اسمٰعیل کے صرف ایک وصف امتیازی ہی کو پیش نظر رکھ کر نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اپنے مقابل میں ان کی تحقیر کا پہلو بھی ان کے ذہن میں ہوتا تھا لیکن امیت و بدویت اور کتاب و شریعت سے بیگانگی چونکہ بطور ایک امر واقعہ کے ان کے اندر موجود تھی اس وجہ سے قرآن نے، جیسا کہ سورۂ جمعہ میں ہم واضح کریں گے، اس لفظ کو ان کے لیے بطور ایک امتیازی لقب کے استعمال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا اور صحابہؓ بھی اس کو بلا کسی احساس کہتری کے استعمال کرتے تھے گویا بنی اسرائیل کے بالمقابل ان کے لیے یہ ایک امتیازی لقب تھا۔

نبی اُمّی کی پیشنگوئیاں پچھلے صحیفوں میں

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات و انجیل کی جن پیشین گوئیوں کا حوالہ ہے ان میں سے بعض کا، جو موجودہ تورات و انجیل میں بھی موجود ہیں، ذکر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ محض بطور یاد دہانی ان کا حوالہ یہاں ہم پھر دیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب، بنی اسمٰعیل کے اندر ایک صاحب رسالت نبی کی بعثت سے پہلے سے واقف تھے اور اس کا چرچا ان کے ہاں برابر قائم رہا ہے۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا

کرے گا، تم اس کی سُننا۔۔۔۔۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ استثنا ۱۸۔ ۱۵۔ ۱۹

اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰؑ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسمٰعیل یعنی امیوں میں پیدا ہوگا اس لیے کہ اس سیاق میں "تیرے بھائیوں میں سے" یا "انہی کے بھائیوں میں سے" کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی زبان مبارک سے گویا اسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی تفصیلات اس کی بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا بلکہ رسول بھی ہوگا اس لیے کہ "میری مانند" اور "تیری مانند" سے مراد حضرت موسیٰؑ کے مانند ہے اور حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔

"خدا سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی"۔ استثنا ۳۳ ۲

"آتشی شریعت" سے میرے نزدیک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیحؑ نے ظاہر فرمائی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھس سے الگ کرے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا۔ یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔

یسعیاہ نبی کی پیشینگوئی ان الفاظ میں مذکور ہے۔

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا، اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا"۔ یسعیاہ ۴۲ ۱۔ ۴

سیدنا مسیحؑ کی پیشینگوئی ملاحظہ ہو۔

یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں

تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی ۲۱: ۴۲-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔" یوحنا ۱۴: ۱۶

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" یوحنا ۱۴: ۳۱

ان پیشینگوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشینگوئیوں کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اس پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے لیکن جو شخص بھی ان پیشینگوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آ سکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی راست آ سکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلعم کا تعارف

'يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ الآية'۔ ان باتوں کا حوالہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف ہی کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہود نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں بھی لاد رکھی تھیں اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر عاید کر دی گئی تھیں۔ ان ساری چیزوں کے دور ہونے کا انحصار آخری رسول کی بعثت پر تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے ان کی یہ ساری زنجیریں کاٹ دیں لیکن انھوں نے اپنی شامتِ اعمال کے سبب سے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ اس مسئلہ پر آل عمران آیت ۹۳ - مائدہ آیت ۵ کے تحت بھی ہم لکھ چکے ہیں اور سورہ انعام کی تفسیر میں بھی اس پر وضاحت سے بحث ہوئی ہے اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اہل کتاب کی نجات کا انحصار نبی امی پر ایمان لانے

'فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ الآية' یہ اہل کتاب کو دعوت ایمان ہے کہ جو لوگ اس رسول کے باب میں سابق پیشینگوئیوں کے امین ہیں اور جن کو اس کی بعثت سے یہ سعادت حاصل ہونے والی ہے کہ تمام غیر فطری بندھنوں اور پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے سب سے پہلے انہی کا حق ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں، لوگوں میں اس کا تعارف کرائیں، مخالفوں کے مقابل میں اس کی حمایت کریں اور اس روشنی یعنی قرآن کی پیروی کریں جو اللہ

کی طرف سے دے کر وہ بھیجا گیا۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پانے والے بنیں گے باقی سب محروم و نامراد ہوں گے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۵۸)

آنحضرت کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی

جب بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر تک پہنچ گئی تو برسرِ موقع آپ کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت بھی دلوا دی گئی کہ اے لوگو، میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ "سب لوگوں کی طرف" یعنی بنی اسمٰعیل و بنی اسرائیل، عرب اور غیر عرب سب کی طرف۔ اوپر کی پیشینگوئیوں میں بھی تصریح ہے کہ اگرچہ آپ کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہو گی لیکن آپ کی رسالت سب کی طرف ہو گی اور دنیا کی سب قومیں آپ کی برکات میں سے حصہ پائیں گی۔ اہل عرب پر، عام اس سے کہ وہ بنی اسمٰعیل ہوں یا بنی اسرائیل، آپ نے اللہ کی حجت براہ راست قائم کی اور وقت کے ملوک و سلاطین کو بھی آپ نے دعوت دی اور آپ کے بعد اس دعوت و شہادت کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر ڈالی جس کو 'شُھَدَاءُ اللہ فی الارض' کے منصب عالی پر سرفراز فرمایا۔

'اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے جس کا میں رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اسی کے اختیار میں تو ہو یا کا عزل و نصب ہے تو کسی بے جا عصبیت، کسی غلط اعتماد اور کسی بے بنیاد غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اللہ اور اس کے نبی اُمّی رسول پر جس کی پیشینگوئیاں تمھاری اپنی کتابوں میں موجود ہیں ایمان لانے سے گریز نہ اختیار کرو۔

'اَلَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے جو اوپر حضرت موسیٰؑ کی پیشینگوئی میں مذکور ہوئی ہے کہ میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ وہی لوگوں سے کہے گا، مطلب یہ ہوا کہ نبی کے اس دعوائے نبوت اور اس کی اس دعوت کو کسی وہم، کسی خیال اور دوسروں پر برتری اور سیادت حاصل کرنے کی کسی خواہش پر مبنی نہ سمجھو۔ یہ تو وہی کچھ تمھیں سنایا جا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے آرہا ہے۔ پیغمبر خود اللہ پر اور اس کی ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی ایمان کی دعوت تمھیں دے رہا ہے۔ یہ اس کی اپنی کوئی ایجاد نہیں ہے۔ دوسرے اس میں وہ دھمکی بھی مضمر ہے جو اوپر والی پیشینگوئی میں مذکور ہے کہ چونکہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے اس میں پیغمبر کی طرف سے کسی کمی بیشی، کسی حذف و اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر پیغمبر نے اس کی تبلیغ میں کوئی مداہنت برتی تو خدا اس سے اس کا مواخذہ فرمائے گا اور اگر لوگوں نے اس سارے اہتمام کے باوجود اس کا حق نہ پہچانا تو ان سے مواخذہ ہو گا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۱۵۹)

صالحین اہل کتاب کی حوصلہ افزائی

ہم پیچھے ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں اور بد اعمالیوں پر شدت کے ساتھ سرزنش کی ہے وہاں ان کے اندر کے اس گروہ قلیل کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق و عدل پر قائم رہا ہے اور جس کی بدولت بنی اسرائیل کو ان کے جرائم کے باوجود مہلت ملتی رہی ہے۔ یہاں بھی اسی گروہ کی طرف اشارہ ہے اور لفظ 'اُمَّۃ' کی تنکیر اس کی قلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ 'یَھْدُوْنَ' اور 'یَعْدِلُوْنَ' مضارع کے صیغے استمرار کو ظاہر کر رہے ہیں اس لیے کہ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جہاں موسیٰ کی قوم میں اس طرح کے ناب کار و ناہنجار پیدا ہوتے ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا، وہیں ان کے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی برابر رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ یعنی علما اور قضاۃ دونوں ہی گروہوں میں اچھے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح کا ایک گروہ، قلیل تعداد میں سہی، ان آیات کے نزول کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہی لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ ان کے یہاں ذکر سے مقصود ان کی حوصلہ افزائی ہے اور اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ نے یہ اہل کتاب کو جو دعوت دی ہے وہ اس طرح کے صالحین پر اثر انداز ہوگی اور وہ نبی امی پر ایمان لائیں گے۔

اس آیت پر وہ تضمین یا تخلیص جو 'اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ' سے شروع ہوئی تھی ختم ہوئی اور آگے سلسلۂ کلام پھر بنی اسرائیل کی اسی سرگزشت سے جڑ گیا جو بیان ہو رہی تھی۔

وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ (۱۶۰-۱۶۲)

ناشکری کے باوجود بنی اسرائیل پر احسان

معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یہ آیتیں بقرہ میں بھی گزر چکی ہیں۔ وہاں پوری تفصیل سے ان کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ۵۷، ۶۰ بقرہ۔ لفظ 'اَسْبَاط' پر بھی بقرہ کی آیت ۱۳۶ کے تحت گفتگو ہو چکی ہے۔ لفظ 'تقطیع' یہاں اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایک ہی باپ کی اولاد بارہ خاندانوں کی شکل میں پھلی پھولی، اور ہم نے ہر خاندان کو امتوں اور قوموں کی شکل میں بڑھایا اور پھیلایا اور اسی اعتبار سے ان کو اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے بھی نوازا لیکن انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی۔

وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ

يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (۱۶۳-۱۶۶)

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الاٰیۃ، یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کا ذکر بقرہ آیات ۶۵-۶۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان چیزوں پر روشنی ڈالیں گے جو وہاں بیان نہیں ہوئی ہیں۔

بنی اسرائیل کو ان کی پچھلی کارستانیوں کی یاد دہانی

وَسْـَٔلْهُمْ کا اسلوب زجر و توبیخ کو ظاہر کر رہا ہے۔ 'هُمْ' سے مراد یہود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اپنی ان تمام کرتوتوں کے باوجود جو بیان ہوئیں اپنی پاکی و برتری کے زعم سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو خدا کا چہیتا اور لاڈلا بنائے بیٹھے ہیں تو ذرا ان سے اس قریہ کا ماجرا پوچھو جس نے سبت کی بے حرمتی کی اور اس کی سزا میں خدا نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا۔ قرآن نے اس قریہ کی اس سے زیادہ تصریح نہیں فرمائی کہ یہ سمندر کے کنارے تھا۔ تورات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن قرآن کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کے یہود اپنی تاریخ کی ایک مشہور روایت کی حیثیت سے اس کو جانتے تھے۔ چنانچہ بقرہ میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ (اور ان کو تو تم جانتے ہی ہو جنھوں نے تم میں سے سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا) ظاہر ہے کہ یہود کے روبرو اس اسلوب میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ان کے درمیان شہرت رکھتی ہو ورنہ وہ قرآن کے اس بیان کی ضرور تردید کرتے۔ بعض لوگوں نے اس کو ایلہ اور عقبہ کے پاس کا کوئی شہر بتایا ہے۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ سمندروں کے کنارے کے شہر، اگر جائے وقوع مناسب ہو تو تجارتی مرکز بن جاتے ہیں اور بہت ترقی کر جاتے ہیں۔ عقبہ کے علاقے کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں قدیم زمانے سے شہرت حاصل ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے بحری بیڑے کا مرکز بھی یہی تھا۔ لفظ 'قریۃ' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ صرف چھوٹی بستیوں ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ اس کا اطلاق بڑی بڑی مرکزی آبادیوں پر بھی ہوتا ہے۔

لفظ شُرَّع کی تحقیق اور مچھلیوں کے اُمنڈنے کی نوعیت اور حکمت

اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا، شُرَّع، شَارِعَۃ کی جمع ہے۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے ان کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جائیے تو یہ دلکش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر اس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوئے ہیں۔ سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں ان میں یہ منظر اور

بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ یہود کی شریعت میں سبت یعنی ہفتہ کے دن کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ اُنھوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کر لیے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کے حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے بھی باز نہیں آتی تو اس معاملے میں اس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آتیں یا بہت ہی کم نظر آتیں لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ ان کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز ان کی حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ مشہور ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جائے اس کی خواہش اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خواہش وہ بلا ہے کہ اس کے اثر سے بسا اوقات آدمی کی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ خواہش نہ ہونے کی صورت میں جو چیز چھٹانک بھر نظر آتی ہے، خواہش کے غلبہ کی حالت میں وہی سیر بھر نظر آنے لگتی ہے۔ مشہور ہے کہ حُسن کا اندازہ کرنے میں حسن سے زیادہ حسنِ نظر کو دخل ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنی شامتِ اعمال سے اس دہرے فتنے میں مبتلا ہو گئے اور پھر اس حد تک خراب ہوئے کہ نیکوں کی تلقین و موعظت تو درکنار خدا کے عذاب سے بھی ان کو تنبیہ نہیں ہوئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔

بنی اسرائیل اور امتِ مسلمہ کے امتحان میں مشابہت

سورۂ مائدہ آیت ۹۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جس طرح بنی اسرائیل کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی اسی طرح ہمارے لیے حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کی ممانعت ہوئی اور ہم کو بھی اس طرح کی آزمائش سے بچتے رہنے کی تاکید کی گئی جس میں بنی اسرائیل مبتلا ہو کر اپنے کو تباہ کر بیٹھے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۹۴ مائدہ) (اے ایمان والو، اللہ تمھیں کسی ایسے شکار سے آزمائے گا کہ تم خیال کرو گے کہ تمھارے ہاتھ اور نیزے اس کو پا لیں گے تاکہ اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو اس سے غیب میں ڈرتے ہیں تو جو اس کے بعد حدود سے تجاوز کریں گے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے) تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ شُرَّعًا اور تَنَالُهٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ کے الفاظ پر ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر غور کیجیے تو دونوں کی مشابہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

حقِ نصیحت آخری دم تک

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے شقاوت کی یہ راہ سمجھانے بجھانے والوں کے علی الرغم اختیار کی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کو کوئی آگاہ کرنے والا نہیں تھا، اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنھوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی بلکہ اس حد تک کوشش کی کہ ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بالکل غیر مفید سمجھا اور یہ کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل جو یا تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم یہ کہ کسی شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں۔ لیکن اللہ کے ان بندوں نے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے

کا کام جاری رہنا چاہیے، اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں اپنے فرض سے سبکدوش ٹھہریں گے اور کیا عجب کہ مان ہی جائیں، سو اگر مان گئے تو یہی مطلوب ہے۔

نہی عن المنکر کے بارے میں ذمہ داری کی حد

اس سے اس ذمہ داری کی حد معین ہوتی ہے جو ہر مومن پر دوسروں کو برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کی عاید ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا جب داعی اور ناصح یہ فرض کر لیں کہ اب دعوت و نصیحت کا فرض ادا ہو گیا اس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے بلکہ یہ کام زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہنا چاہیے اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کا قدر کرنے والا نہ نکلے۔ عند اللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے۔ وہ لوگ اللہ کے ہاں بری نہیں ہوں گے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ اس مضمون پر مفصل بحث انفال آیت ۲۵ کے تحت آئے گی۔

خدا کی پکڑ سے صرف حق نصیحت ادا کرنے والے ہی بچتے ہیں

"فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ" یعنی جب وہ تنبیہات جو انھیں کی گئی تھیں وہ بھلا بیٹھے اور کسی طرح سوچنے سمجھنے پر راضی نہ ہوئے تو اللہ نے ان کی اس نافرمانی و عہد شکنی کی پاداش میں ان پر ایک سخت عذاب بھیجا جس سے صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو لوگوں کو برائی سے روکنے والے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی اجتماعی نافرمانیوں پر جب اللہ کا کوئی فیصلہ کن عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی پکڑ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو برائی سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

لعنت بدترین عذاب ہے

"فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ" الآیۃ یہ اس لعنت کا ذکر ہے جو ان نافرمانوں پر ہوئی اور جس کا ذکر بقرہ ۶۵ اور مائدہ ۶۰ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ کسی قوم پر اللہ کی لعنت اس عذاب سے بھی سخت تر چیز ہے جو کسی قوم کو فنا کر دیتا ہے اس لیے کہ لعنت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم بظاہر زندہ رہتی ہے لیکن اس کی زندگی صرف ذلت و خواری کی ایک داستانِ عبرت ہوتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اس بستی پر اللہ کی ایسی لعنت ہوئی کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گئی۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۶۷)

یہود ابدی لعنت ہے

"تأذن" کا صحیح مفہوم کسی فیصلۂ قطعی سے لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کی اس طرح کی بدعہدیوں کی بنا پر ان کو ان کے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر ایسے لوگوں کو قیامت تک مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت سخت عذابوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ اس طرح کی تنبیہ ان کو حضرت موسیٰؑ نے بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت آشکارا الفاظ میں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے۔ "اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو ...... اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا ...... اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہو گا اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤ گے اور

جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے۔ ۱ اجار ب ۲۶ ۱۴-۱۷۔ اسی طرح کتاب استثنا میں ہے " تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا۔ استثنا باب ۲۸-۳۲۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی عملی تصدیق تاریخ کے صفحات میں مرقوم ہے۔ اس کے لیے بخت نصر اور ٹیٹس سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک کی تاریخ پڑھ جائیے، ہر دور میں آپ کو اس قوم کی ذلت و بربادی کی نہایت لرزہ خیز داستان مل جائے گی۔ یہ ملحوظ رہے کہ بیچ بیچ میں مہلت کا کوئی وقفہ مل جانے سے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی ہے۔ قرآن کا اسلوب بیان خود شاہد ہے کہ ان کو وقفے بھی ملتے رہیں گے لیکن ہر وقفہ ان کے لیے کسی تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ آج ارض مقدس میں ان کا جو اجتماع ہو رہا ہے یہ آشیاں بندی بھی ایک نئے طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری مجتمعہ قوت انشاء اللہ یک قلم ختم ہو جائے گی۔ یہاں اشارہ پر کفایت کیجیے۔ اس کی وضاحت سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں آئے گی۔

اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ میں اس فیصلہ الٰہی کی حقیقت صفات الٰہی کے آئینہ میں دکھائی گئی ہے کہ کوئی خدا کو اس دنیا کے معاملات سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہ خیال کرے۔ جو لوگ اس کی راہ سے بے راہ ہوتے ہیں ان کو وہ سزا بھی بڑی ہی سخت دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لیے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ 'عقاب' کے ساتھ 'سریع' کی صفت ان لوگوں کی بلادت پر ضرب لگانے کے لیے ہے جو خدا کی دیر کو اندھیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اس کی بخشی ہوئی مہلت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ جب پکڑتا ہے تو آناً فاناً پکڑتا ہے اور جن کو پکڑتا ہے وہ بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ صبح کی شام بھی نہیں ہونے پائی کہ دھر لیے گئے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۶۸)

بنی اسرائیل کا انتشار — وَقَطَّعْنٰهُمْ اوپر آیت ۱۶۰ میں بھی گزر چکا ہے، وہاں جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا اچھے مفہوم میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اس کے برعکس ان کی پراگندگی اور انتشار کے دور کے حالات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی جو تنظیم کی وہ اپنے پورے شباب پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں پہنچی۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد اس تنظیم میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا اور پھر بتدریج حالات ایسے خراب ہوتے گئے کہ یہود اپنے مرکز میں بھی محکوم ہو گئے۔ یہاں تک کہ گروہ گروہ ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ اگرچہ انفرادی حیثیت سے ان میں نیک بھی تھے اور بد بھی لیکن اجتماعی حیثیت سے وہ ان اوصاف سے محروم ہو چکے تھے جو ایک ملت کی حیثیت سے ان کو دنیا میں سربلند رکھنے کے لیے ضروری تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو اچھے اور برے ہر طرح کے حالات سے آزمایا تاکہ وہ اپنے رب کی

طرف رجوع کریں لیکن ان کی خواہشیں اس طرح ان پر غالب آگئی تھیں کہ ان کے آگے ان کی قوت ارادی بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے وہی کام کیے جاتے اور اپنے ضمیر کو یہ دھوکا دیتے کہ ہم خدا کے چہیتوں اور محبوبوں کی اولاد ہیں، خدا ہمیں معاف ہی کر دے گا۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ
اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا
الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶۹)

روز افزوں زوال — عربی میں جب لفظ 'خَلْف' سکون لام کے ساتھ آتا ہے تو بُرے جانشینوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہ یہود کے تدریجی زوال کی طرف اشارہ ہے کہ دن پر دن ان کے اخلاقی حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے یہاں تک کہ ایسے بُرے لوگ کتاب (تورات) کے وارث ہوئے جو ایک طرف کتاب الٰہی کے وارث ہونے کے مدعی ہیں دوسری طرف پست ہمتی اور دنادت کا یہ عالم ہے کہ جو لقمۂ حرام بھی ملتا نظر آئے اس کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ کتابِ الٰہی کے نام لیوا ہونے کے سبب سے اگر ضمیر میں کوئی خلش پیدا ہوتی بھی ہے تو ان جھوٹی آرزوؤں سے اس کو بہلا لیتے ہیں جو انھوں نے بالکل بے دلیل و سند اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں کہ ہم برگزیدہ امت ہیں، ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسے نبیوں کی اولاد ہیں، دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے، اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں اللہ ہمیں معاف ہی کر دے گا۔ اس طرح اُنھوں نے اپنے ضمیر اور ایمان کو اس طرح کُند بنا دیا ہے کہ ایک حرام کے بعد اگر اسی طرح کی حرام خوری کا کوئی اور موقع نکل آئے تو اس پر بھی پھسل پڑتے ہیں۔ ان کی اسی دنادت کی وجہ سے آگے چل کر ان کی مثال کتے سے دی ہے جو ہر وقت اپنی زبان نکالے رکھتا ہے خواہ اسے چمکار لیے یا جھڑکیے۔

سارا پڑھا لکھا برباد — 'اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ الآیہ' یعنی کتاب کے باب میں تو، جیسا کہ آیت ۱۴۵ میں گزرا اور تورات میں بھی بار بار ذکر ہوا ہے، ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جو ہدایات اس کتاب میں دی جا رہی ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑیں، بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوں، کوئی بات حق کے خلاف خدا پر نہ لگائیں، تو پھر انھوں نے حرام خوری اور حرام کاری کی یہ راہ کس طرح کھول لی اور اس کے حق میں شریعت کی سند کہاں سے فراہم کر دی!

'وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ' یعنی انھوں نے اچھی طرح اس کتاب کو پڑھا بھی ہے، یہ نہیں کہ اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ 'درس' کے لفظ پر ہم انعام آیت ۱۰۵ کے تحت بحث کر آئے ہیں کہ اس کے اصل معنی گھسنے کے ہیں جب کتاب بار بار پڑھی جائے، اور وہ بھی انگلی رکھ کے تو ورق گھس جایا کرتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی اچھی طرح پڑھنے کے آنے لگے۔ یہاں یہ لفظ یہود کے لیے بطور تعریض استعمال ہوا ہے کہ کتاب کو تو پڑھتے پڑھتے انھوں نے گھس ڈالا لیکن حال وہی رہا کہ ساری زلیخا پڑھ جانے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ زلیخا زن بود کہ مرد! 'وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ' یعنی یہ سگانِ دنیا جو کتاب و شریعت سب کو بالائے طاق رکھ کے

اس طرح دنیا کے پیچھے پڑ گئے، انھیں آخرت کی نعمتوں اور کامرانیوں کا کوئی اندازہ نہیں، حالانکہ چاہنے کی اصل چیز وہی ہے لیکن ان بے وقوف لوگوں میں وہ عقل کہاں؟

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۷۰)

مُصلحین اہلِ کتاب کی حوصلہ افزائی

'تمسیک' اور 'تمسک' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا یا تھامنا۔

آیت کا مطلب اوپر کی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ بدقسمت لوگ تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل کھڑے ہوئے حالانکہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ لوگ خلق کی اصلاح کرنے والے بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ اقامت نماز، یہاں تمسک بالکتاب کی علامت کی حیثیت سے بھی مذکور ہے اور یہ چیز درحقیقت ہر عہد الٰہی کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں، محافظ بھی ہے۔ آیت میں بقاعدۂ ایجاز ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے 'اور جو کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہیں اور جنھوں نے نماز کا اہتمام کیا وہی لوگ اصلاح کرنے والے ہیں اور بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔' میرے نزدیک اس آیت میں اہل کتاب کے اس قلیل التعداد گروہ کی حوصلہ افزائی بھی ہے جو قوم کے عام بگاڑ کے باوجود حق پر قائم رہا اور جو بالآخر مشرف باسلام ہوا۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۱)

اس آیت کی تفسیر بقرہ آیت ۶۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہ اس میثاق کی طرف اشارہ ہے جو یہود سے دامن کوہ میں کتاب پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لیے لیا گیا تھا اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال و جبروت کا بھی ان کو مشاہدہ کرایا تھا تاکہ وہ یاد رکھیں کہ جس خدا سے وہ عہد کر رہے ہیں وہ بے پناہ قوت و قدرت والا ہے لیکن انھوں نے اپنی خواہشات کے پیچھے ہر چیز کو بھلا دیا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۷۲-۲۰۶

آگے کا مضمون خاتمۂ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تمہید میں عرض کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں مخاطب اصلاً قریش ہیں۔ ان کو پہلے خود ان کے اپنے ملک کی ان قوموں کے حالات سنائے گئے جو ماضی میں گزر چکی تھیں پھر بنی اسرائیل کی بھی پوری تاریخ تفصیل سے سنا دی گئی جو سامنے موجود تھے۔ مقصود ان قوموں کی تاریخ سنانے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اپنی اس دنیا کے احوال و معاملات سے بے تعلق اور کنارہ کش نہیں ہے۔ وہ خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے ہمیشہ اپنے رسول بھیجتا رہا ہے اور وہ رسول جب بھی آئے ہیں عزل و نصب کی میزان بن کر آئے ہیں۔ جن قوموں نے ان کی تکذیب

آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۷۲-۲۰۶ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ
معانقه عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚۛ شَهِدْنَا ۚۛ اَنْ تَقُوْلُوْا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ
اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا
بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ
مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا
لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ
ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ
الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ
ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ڮ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا
يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا
يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ

يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَمِمَّنْ
ع ٢٢ / ١٢ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾
وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِهِمْ
مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ
يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ
وقف منزل / وقف لازم اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ
حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ
معانقة اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَمَا
ع ٢٣ / ١٣ مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا
لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ
اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ

الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ج
فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ط سَوَآءٌ
عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ
يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾
اِنَّ وَلِيِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ط وَتَرٰىهُمْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ
وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ط اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا
مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾
وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَاِذَا لَمْ
تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ط قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى

اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ؕ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ
یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْغٰفِلِیْنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ
ع ۲۴ ۱۸ ۱۴ یُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ۩ السجدة

ترجمۂ آیات ۱۷۲-۲۰۶

اور یاد کرو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے — ان کی پیٹھوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔ یا عذر کرو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کے خلف ہوئے تو کیا باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کرے گا ؟ اور ہم اسی طرح اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۱۷۲-۱۷۴

اور ان کو اس کی سرگزشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا، پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی تمثیل کتے کی ہے اگر تم اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یا چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھتا ہے۔ یہ تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

تو ان کو سرگزشت سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتی رہی۔ جسے اللہ ہدایت بخشے وہی ہدایت پانے والا بنتا ہے اور جنھیں وہ گمراہ کر دے وہی ہیں جو نامراد ہوتے ہیں۔ (۱۷۵-۱۷۸)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں اور اللہ کے لیے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں تو انہی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے باب میں کجروی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔ اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی رہا ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور اس کے مطابق فیصلے کرتے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہم ان کو وہاں سے داؤں پر لے جا رہے ہیں جہاں سے انھیں علم نہیں اور میں انھیں ڈھیل دیے جا رہا ہوں کیونکہ میری تدبیر بہت ہی محکم ہے۔ ۱۷۹-۱۸۳

کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے وہ تو بس ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا ہے۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر نگاہ نہیں کی جو خدا نے پیدا کی ہیں اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی مدت قریب آ لگی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے، جن کو خدا گمراہ کر دے ان کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان کو وہ ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا

چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آدھمکے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا تم اس کی تحقیق کیے بیٹھے ہو۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ کہہ دو، میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔ ۱۸۴-۱۸۸

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا کہ وہ اس سے تسکین پائے تو جب وہ اس کو چھا لیتا ہے تو وہ اٹھا لیتی ہے ایک ہلکا سا حمل، پھر وہ اس کو لیے کچھ وقت گزارتی ہے تو جب بوجھل ہوتی ہے دونوں اللہ اپنے رب سے دعا کرتے ہیں، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی ہم تیرے شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیزمیں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں۔ اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتی ہیں۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھارے ساتھ نہ لگیں گے، یکساں ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمھارے ہی جیسے بندے

ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہہ دو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، میرے خلاف چالیں چل دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکوکاروں کی کارسازی فرماتا ہے اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو نہ وہ تمھاری ہی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تمھیں کوئی وسوسۂ شیطانی لاحق ہونے لگے تو اللہ کی پناہ چاہو، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتًہ ان کے دِل روشن ہو جاتے ہیں۔ اور جو ان ناخدا ترسوں کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں پھر کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ۱۸۹ - ۲۰۲

اور جب تم ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے کہتے ہیں کہ اسے کیوں نہ گھڑ لائے! کہہ دو، میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ اور جب قرآن سُنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۲۰۳ - ۲۰۴

اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے اور غافلوں میں سے نہ بنو۔ بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے نہیں اکڑتے، وہ اس کی تسبیح کرتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ ۲۰۵-۲۰۶

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۷۲-۱۷۴)

'اذ' اور واحد کے خطاب کے مواقع استعمال 'وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ' ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'اذ' کے ذریعہ سے کسی ایسے امر واقعی کی یاد دہانی بھی کی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو، قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کو فراموش کیے ہوئے ہوں یا اس سے منحرف ہوں۔ اسی طرح واحد کے خطاب کے متعلق بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرینہ دلیل ہو تو یہ جمع کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے اور اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔

'من ظہورہم' کی قید کا فائدہ 'مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ' میں 'مِنْ ظُهُوْرِهِمْ'، 'مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ' سے بدل واقع ہے اور اس بدل کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بنی آدم سے متعلق یہاں جو حقیقت بیان ہو رہی ہے وہ کسی خاص دور ہی کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ قیام قیامت تک جتنے بھی بنی آدم پیدا ہونے والے ہیں سب ہی سے متعلق ہے۔

تمام بنی آدم سے خدا نے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا 'وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، اس کے جواب میں سب نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ یہ اقرار اللہ تعالیٰ نے صرف اس بات کا نہیں لیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا کہ وہی رب بھی ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اہل عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لیے تھے حالانکہ عہد فطرت میں اقرار صرف اللہ ہی کی ربوبیت کا ہے۔

توحید بدیہیات فطرت میں سے ہے

'اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ'، 'اَنْ' سے پہلے 'کَرَاھَۃَ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مبادا تم قیامت کے دن عذر کرو، اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک توحید اور بدیہیاتِ فطرت کا تعلق ہے ان کے باب میں قیامت کے دن مواخذہ ہر شخص سے مجرد اس اقرار کی بنا پر ہوگا جو مذکور ہوا، قطع نظر اس سے کہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی یا نہیں۔ اگر کسی نبی کی دعوت اس کو پہنچی ہے تو یہ گویا ایک مزید حجت اس پر قائم ہوگئی کہ اس کی مسئولیت دوچند ہوگئی لیکن نبی کی دعوت اگر نہیں پہنچی تو یہ بدیہیات فطرت کے معاملے میں کوئی عذر نہیں بن سکے گی۔ ان پر مواخذہ کے لیے فطرت کا یہ عہد کافی ہے۔

'اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَکَ اٰبَآؤُنَا الایۃ' اسی طرح لوگوں کا یہ عذر بھی کچھ کام نہ آئے گا کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے، ہم انہی کے ہاں پیدا ہوئے اور پھر قدرتی طور پر ہم نے انہی کے طریقے کی پیروی کی اس وجہ سے یہ جرم ہمارا نہیں بلکہ ان کا ہے، اس کی سزا ان کو ملنی چاہیے نہ کہ ہم کو۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے اس وجہ سے اس باطنی شہادت سے انحراف کے لیے خارجی اثرات کا عذر بھی کسی کا خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا۔

'وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ الایۃ' اس آیت میں قرینہ دلیل ہے کہ 'وَلَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر اس کو کھول دیا جائے تو ہمارے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل اس لیے کر رہے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر اپنی حجت اس طرح قائم کر دیں کہ ان کے لیے کوئی ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہ جائے اور تاکہ اس وضاحت کے بعد ان میں سے جو شرک سے تائب ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیں وہ رجوع کر لیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے مذکورہ عہد لینے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے اس عہد و میثاق کی پوری تفصیل بھی سنا دی تاکہ جو اپنی غلطی سے توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کر لیں اور جو اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہیں وہ اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنے ہی کو سمجھیں، کسی اور کی گردن پر اس کا بار الزام ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

عہد فطرت سے متعلق بعض سوال اور ان کے جواب

اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کیا ہے اور اس کی اہمیت یہ بتائی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے ہر شخص مجرد اسی عہد کی بنا پر عنداللہ مسئول ہوگا۔ اس کی اس اہمیت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عالم غیب کے کسی ایسے ماجرے کی یادداشت انسان کے ذہن میں محفوظ ہے جس کا یہاں ذکر ہوا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ کس طرح باور کیا جائے کہ فی الواقع انسان نے اس طرح کا کوئی اقرار کیا ہے اور اس کی بنیاد پر وہ توحید کے معاملے میں عنداللہ مسئول ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اس اقرار کا تعلق ہے وہ تو ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے، رہا اس کا موقع و محل اور اس کی تاریخ تو وہ اگر یاد نہیں رہی تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت

پر کوئی اثر نہیں پڑتا، زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقرار تو مجھے یاد ہے البتہ اس کا موقع و محل یاد نہیں ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس کا موقع و محل بتا دیا کہ یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالمِ غیب میں خدا نے اس سے لیا ہے اور یہ بات خدا ہی بتا سکتا تھا اس لیے کہ غیب کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔ انسان پر حجت قائم ہونے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔

دین کا نقطۂ آغاز

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کے اندر ابتدا ہی سے یہ اقرار موجود ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان وجود میں آنے کے بعد دین کا آغاز خالص خدا پرستی اور توحید سے کرتا لیکن ہمارے نئے فلسفی تو یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا ہے۔ دنیا میں گوناگون حوادث کے ظہور نے اس کے اندر مختلف ان دیکھی طاقتوں کا خوف پیدا کیا، اس خوف نے اس کے اندر ان اَن دیکھی طاقتوں کی پرستش کا خیال پیدا کیا، چنانچہ اس نے ان کی پرستش شروع کی، پھر آہستہ آہستہ اس کے علم میں جتنی ترقی ہوتی گئی ان وہمی معبودوں سے چھوٹ کر وہ اقرارِ توحید کی منزل تک پہنچا۔ ہم نے نئے فلسفیوں کے اس واہمہ کی تردید سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بھی کی ہے اور اس سے زیادہ تفصیل اپنی کتاب حقیقت شرک میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تقریر بالکل غیر منطقی ہے۔ ہم نے مذکورہ کتابوں میں واضح کیا ہے کہ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے زائل ہونے یا چھن جانے کے اندیشہ کا جو انسان کو حاصل بھی ہو اور جو عزیز و محبوب بھی ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ نعمت، منعم، اور اس کی شکرگزاری کا شعور اور جذبہ، خوف کے جذبہ اور اس کے عوامل پر مقدم ہے اس وجہ سے انسان نے خوف سے دین کا آغاز نہیں کیا بلکہ اپنے منعم پروردگار کی شکرگزاری اور اس کی عبادت سے دین کا آغاز کیا لیکن پھر مختلف اسباب کے تحت، جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب حقیقتِ شرک میں کی ہے، وہ اس جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مختلف پگڈنڈیوں پر نکل گیا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی فطرت بالکل ایک لوحِ سادہ ہوتی ہے، اس پر جتنے نقوش بھی ابھرتے ہیں بعد میں ادراک و شعور پیدا ہونے کے بعد محض ماحول کے اثر سے اُبھرتے ہیں لیکن یہ خیال محض مغالطہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ماحول اپنے اندر نئے آنے والوں پر جو اثرات ڈالتا ہے وہ خود اس نے کہاں سے لیے ہیں۔ ماحول کے پاس رطب و یابس روایات کا جو اندوختہ بھی ہے وہ سب اس کی فطرت ہی کے بناؤ یا بگاڑ کا کرشمہ ہے جو باتیں اس کی فطرت کے اصل منبع سے اُبھری ہیں وہ خیر، عدل اور معروف ہیں اور جن پر ان کی خواہشات کی بے اعتدالیاں غالب آگئی ہیں وہ شر اور ظلم بن گئی ہیں۔ خدا کے معاملے میں بھی یہی بے اعتدالی اس سے صادر ہوئی ہے۔ اس کی اصل فطرت کے اندر صرف ایک خدائے وحدہٗ لاشریک ہی کا اقرار مضمر ہے۔ اتنے پر دنیا کے مشرک اور موحد سب متفق ہیں اس وجہ سے یہ چیز کسی دلیل کے قیام کی محتاج نہیں ہے البتہ شرک کے مدعیوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ایک پر جو دوسرے معبودوں کا اضافہ کرتے ہیں ان کی وہ دلیل پیش کریں چنانچہ قرآن نے ان سے جگہ جگہ یہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ شریکوں

کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔

قرآن کا سارا فلسفہ درحقیقت انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جن عقائد و اعمال اور جن اچھائیوں اور نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر لادی نہیں جا رہی ہے بلکہ اس کو انہی باتوں کی یاددہانی کی جا رہی ہے جو اس کی اپنی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن اس نے اپنی لذات عاجلہ کے پیچھے پڑ جانے کے سبب سے ان کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ قرآن نے اس وجہ سے اپنے آپ کو 'ذکر' اور 'ذکریٰ' کہا ہے جن کے معنی یاددہانی کے ہیں اور اپنی تعلیم و دعوت کو "تذکیر" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی فراموش کردہ یا نظر انداز کردہ حقائق کے یاد دلانے کے ہیں۔

یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے لیکن اس زمانے کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر مارکس اور فرائڈ کا جادو چلا ہوا ہے۔ ان ظالموں کی خاکبازیوں نے لوگوں کو اس طرح اندھا بنا دیا ہے کہ اب لوگوں کو انسان کے اندر بطن اور فرج کے سوا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ان کے نزدیک انسان کا سارا فکر و فلسفہ بس انہی دو محوروں پر گھوم رہا ہے۔ اس روایتی چوہے کی طرح جسے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی تو اس نے پنساری کی ایک دکان کھول لی، مارکس اور فرائڈ نے بھی بطن و فرج پر سارے فکر و فلسفہ اور تمام مذہب و اخلاق کو ڈھکا دیا اور اس طرح ان لوگوں کو جو پہلے ہی بطن و فرج کے غلام تھے دو ایسے مرشد بھی مل گئے جن کا وہ فخر کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں کہ وہ بے پیرے نہیں ہیں بلکہ انھیں بھی شرف نسبت و ارادت حاصل ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلًا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۷۵-۱۷۸)

'وَاتْلُ عَلَيْهِمْ الاية' 'هُمْ' سے مراد قریش ہیں جن کو اوپر والی آیات میں مخاطب کر کے عہد فطرت کی یاددہانی کی گئی ہے۔

یہود کی تمثیل

'الَّذِيْٓ' اگرچہ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے لیکن تمثیلات میں یہ لازم نہیں ہے کہ اس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو جو خارج میں بھی موجود ہو بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نگاہ میں رکھ کر اس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعہ کی تصویر کشی ہوتی ہے اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اس کو نکرہ کے بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں متمثل ہو کر اس طرح سامع کے سامنے آجائے

کہ گویا اس نے اس کی سرگزشت صرف سُنی ہی نہیں بلکہ خود اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ یہاں اس 'اَلَّذِیْٓ' سے مراد یہود من حیث القوم ہیں جن کی تمثیل ایک ایسے شخص سے دی گئی ہے جس کو خدا نے اپنی آیتوں سے نوازا لیکن اس نے ان کی قدر نہ کی بلکہ یہ خلعت اس نے اتار پھینکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سنتِ الٰہی کے مطابق جو سورۂ زخرف آیت ۳۶ میں بیان ہوئی ہے کہ 'وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ' (جو خدائے رحمان کی یاددہانی سے منہ پھیرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے) شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے بن گیا۔ یہ بات کہ یہ کسی معین شخص کا ذکر نہیں بلکہ خدا کی آیات کی تکذیب کرنے والی ایک قوم کی تمثیل ہے خود قرآن کے الفاظ ہی سے واضح ہے چنانچہ اس کے بعد فرمایا 'ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا' (یہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی) اس وجہ سے ہمارے نزدیک 'اَلَّذِیْٓ' سے کسی بلعام بن باعور کو مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہود میں کوئی ایک ہی بلعام بن باعور نہیں تھا جس کی مثال دی جائے۔ اوپر یہود کی تفصیل کے ساتھ جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے خود واضح ہے کہ یہ پوری قوم کی قوم ہی شروع سے ہی بلعام بن باعور بنی رہی ہے۔ 'انسلاخ' کے معنی کپڑے اتار کر ننگے ہو جانے کے ہیں۔ 'اِنْسَلَخَ مِنْ ثِیَابِهٖ'، تجرد یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان کو اپنی کتاب کی تشریف و خلعت سے نوازا لیکن انھوں نے یہ اتار پھینکی اور بالکل ننگے الف بن کر رہ گئے۔

'وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ'، 'اَخْلَدَ اِلَى الشَّیْءِ' کے معنی کسی شے کی طرف اس طرح جھک جانے اور مائل ہو جانے کے ہوتے ہیں کہ آدمی بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے اگر وہ ان کی قدر کرتے ہیں تو وہ ان کے ذریعہ سے ان کو دین و دنیا دونوں کی سرفرازی عطا فرماتا ہے، ان کی عقل کو ان سے رفعت اور ان کی روح کو ان سے معراج حاصل ہوتی ہے، لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے اور کُتّے کی طرح زمین کو سونگھتے ہی ہوئے چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اُن کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

یہود کی تمثیل کُتّے سے

'فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ': اب یہ ان کے برابر پستی کی طرف جھکے رہنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی تمثیل بیان ہوئی ہے اور دیکھیے کیسی دلنشین اور مطابقِ واقعہ تمثیل ہے۔ اوپر آیات ۱۶۸ - ۱۶۹ میں ان کا حال یہ بیان ہوا تھا کہ خدا نے اپنے انعامات اور اپنی تنبیہات دونوں سے ان کو آزمایا (بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ) لیکن یہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں ایسے بے بس رہے کہ نہ انعامات سے ذرا متاثر ہوئے نہ تنبیہات سے بلکہ ہر طمع نے ان کو ٹھوکر کھلائی

اور ہر خواہش کے آگے انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے (یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ) ان کی اس حالت کی تمثیل کتے سے دی ہے۔ کتے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کبھی بخطِ مستقیم گردن اٹھا کر نہیں چلتا بلکہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اس کی رہنما اس کی آنکھ نہیں بلکہ ناک ہوتی ہے جو اس کی خواہشوں کی سُراغ رساں ہے۔ پھر اس کی یہ بھی خصلت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان نکالے ہوئے رہتا ہے، چمکاریے، پیار کیجیے جب بھی اس کی یہی حالت رہے گی، دھتکاریے، جھڑکیے جب بھی اس کا یہی انداز رہے گا۔ یہ اس کی حرص اور دناءت ہے جو اس کی جبلت پر اس طرح غالب ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ بھوکا رہے گا جب بھی اس کو آپ اسی حال میں پائیں گے، پیٹ بھر کے کھلا دیجیے جب بھی اسی ہیئت میں دیکھیں گے۔ صاحبوں کے کتے مخملیں جھول، ریشمی پٹوں اور چاندی کے گھنگرووں سے آراستہ ہوتے ہیں، پیٹ بھر گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہیں لیکن کار کے اندر صاحب کی بغل میں بیٹھے ہوئے بھی زبان نکالے ہوئے رہیں گے اور پارک کے اندر سیر کرتے ہوئے بھی زمین میں تلاش کرتے، سونگھتے اپنی ناک کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ فرمایا کہ بالکل یہی حال یہود کا ہے۔ ان کو اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں رہا ہے۔ ان کی قوتِ ارادی بالکل معطّل ہو چکی ہے۔ اب یہ اپنی خواہشوں کے غلام اور اپنی حرص کے بندے ہیں اور حرص و دناءت ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی شکلیں آدمیوں کی ہیں لیکن ان کی فطرت کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

آیت میں 'تَحْمِلْ عَلَيْهِ' میرے نزدیک 'تَحْمِلَ الْعَصَا عَلَيْهِ' یا 'تَحْمِلَ الْحَجَرَ عَلَيْهِ' کے معنی میں ہے یعنی لکڑی اٹھاؤ یا اس پر پتھر پھینکو اس کا حال ایک ہی رہے گا۔ 'لَهَثَ' کے معنی زبان نکالنے کے ہیں اور اس کا غالب استعمال کتے کے لیے ہے۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اس ٹکڑے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تمثیل کسی شخص کی تمثیل نہیں بلکہ اس قوم کی تمثیل ہے جس نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اور اس سے مراد، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، یہود ہیں۔ سورۂ نحل آیات ۹۱-۹۲ کے تحت انشاء اللہ ہم تمثیل کے اس پہلو پر مزید بحث کریں گے۔

یہود کی یہ تمثیل، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، قریش کو سنائی گئی ہے اور مقصود اس سے قریش کو اس نعمت کی قدر کرنے کے لیے ابھارنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری شریعت کی شکل میں ان کو مل رہی تھی لیکن وہ اس کی قدر کرنے کے بجائے اس سے بدک رہے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والی قوم کا حال سُنا دو کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی آیات سے نوازتا ہے ان کو وہ ان آیات کے ذریعہ سے زمین و آسمان دونوں کی سرفرازیاں عطا فرمانا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ

ان کی قدر کریں، ان کو اپنائیں اور زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ اگر وہ قدر نہیں کرتے بلکہ اپنی خواہشات ہی کے غلام بنے رہتے ہیں تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو یہود کا ہوا۔

'سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ' مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والی قوم اپنی خواہشات کی غلامی کے سبب سے بالکل ہیزن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال، جیسی کہ اوپر بیان ہوئی، نہایت ہی مکروہ اور گھنونی ہے۔ سو یہ راہ تم نہ اختیار کرو۔ جو لوگ یہ راہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی آیات کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ وہ ان آیات کی ناقدری کر کے خود اپنے ہاتھوں عزت کے تاج کے بجائے اپنے لیے ذلت کا طوق اختیار کرتے ہیں۔

'مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور قریش کے لیے تہدید و وعید بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہی پائیں گے جن کو خدا ہدایت کی توفیق بخشے اور خدا کی توفیق انہی کو حاصل ہوتی ہے جو ہدایت کے طالب ہوں اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ جو لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ کر زندگی گزارتے ہیں خدا انھیں گمراہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور اصلی نامراد اور بدقسمت لوگ وہی ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۷۹)

ہدایت سے محروم رہنے والے

اب یہ بتایا کہ کون لوگ ہیں جو ہدایت سے محروم رہتے ہیں اور بالآخر وہ جہنم کے ایندھن بنتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ جنوں اور انسانوں میں سے وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے دل تو دیے ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو آنکھیں تو بخشیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو کان تو عنایت فرمائے لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ سمجھنا، دیکھنا اور سننا اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں بس اپنی خواہشات کی تابعداری میں لگا رکھی ہیں۔ ان سے ہٹ کر کسی چیز کو سننے سمجھنے اور اس کو اختیار کرنے کا ان کے اندر دم داعیہ نہیں پایا جاتا۔ فرمایا کہ یہ لوگ چوپایوں کے مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ بے عقل ہیں۔ چوپایوں کے مانند اس وجہ سے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے اسی طرح ان کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اس وجہ سے ہیں کہ چوپائے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ بسا اوقات اس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو ایک بیل یا گدھے سے کبھی صادر نہیں ہوتیں۔ مثلاً انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں، پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے لیکن ایک

گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اصلی اور حقیقی بے خبر ہیں اس لیے کہ یہ بے خبری چوپایوں میں بھی نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ جو فرمایا ہے کہ ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو ان کی ماؤں کے پیٹ سے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ ماؤں کے پیٹ سے تو اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ، سمع، بصر کی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ضابطہ یہ بنا دیا ہے کہ جو ان صلاحیتوں سے صحیح فائدہ اٹھائیں گے اللہ ان کی رہنمائی جنت کی طرف فرمائے گا اور جو ان سے فائدہ نہ اٹھائیں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہ دھمکی قریش کے لیے ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۸۰)

اللہ تعالیٰ صرف اچھی صفتوں سے متصف ہے

یہ آیت، اوپر آیت ۱۷۲ میں توحید کا عہدِ فطرت ہونا جو بیان ہوا ہے، اس سے متعلق ہے۔ بیچ میں ان لوگوں کا ذکر آ گیا تھا جنھوں نے اللہ کی آیات کی قدر نہیں کی اور خدا کی طرف سے نہایت اعلیٰ صلاحیتیں پا کر اندھے بہرے بن گئے۔ اب یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے صرف اچھی ہی صفتیں اور اچھے ہی نام ہیں تو اس کو انھیں صفتوں سے پکارو اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑو، جو صفاتِ الٰہی کے باب میں گمراہی کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں، اس کے شریک ٹھہراتے ہیں یا اس کے بیٹے بیٹیاں مانتے ہیں۔ یہ باتیں خدا کی صفاتِ الوہیت، اس کی شانِ یکتائی، اس کی قدرت، اس کی بے نیازی اور اس کے علم کی نفی کرنے والی ہیں۔ خدا کو صرف انھی صفات سے متصف کرنا چاہیے جن کا اس کی الوہیت اور اس کی بے ہمگی و بے ہمتائی کے ساتھ جوڑ ہو سکے، کوئی ایسی صفت اس کی طرف منسوب نہیں کرنی چاہیے جو خالق کو مخلوقات کی صف میں لا کر کھڑا کر دے۔ 'الحاد' کا لفظ یہاں صفاتِ الٰہی کی بے حرمتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ عربی میں اگر کہیں 'فُلَانٌ اَلْحَدَ فِی الْحَرَمِ' تو اس کے معنی ہوں گے 'استحل حرمته وانتهكها'۔ 'يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ' کے معنی ہوئے جو خدا کی صفات کی بے حرمتی و بے توقیری کرتے ہیں یعنی اس کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ لگاتے ہیں جو اس کی ذات و صفات کی اہانت کرنے والی ہیں اور جن سے وہ پاک و برتر ہے۔ یہ جو فرمایا کہ "ان کو چھوڑو" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اگر نہیں مانتے تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ 'سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی سزا عنقریب خود بھگتیں گے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۸۱)

مُردوں کے اندر زندہ بھی ہیں

یعنی خدا کی مخلوق میں سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں۔ اگر ایک طرف وہ اندھے بہرے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا تو کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں، حق کو پہچانتے ہیں، اسی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور معاملات کے فیصلے کرتے ہیں۔ اوپر آیت ۱۵۹ میں جس طرح بنی اسرائیل کے اندر کے اچھے لوگوں کا ذکر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اسی طرح یہاں 'لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ الآیۃ' کے مرگِ انبوہ کے ذکر کے بعد ان زندہ روحوں کی طرف اشارہ کر دیا جن کی فطرت اس وبائے عام اور اس مرگِ انبوہ کے اندر بھی زندہ رہی اور جو بالآخر اسلام

کے نور سے منور ہوئے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (۱۸۲-۱۸۳)

خدا کی ڈھیل ہلاکت کا پھندا ہے

اوپر آیت ۱۸۰ میں آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو جو دھمکی دی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلانے کے باوجود دندنا رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ خدا کی پکڑ سے باہر ہیں۔ ہم ان کو وہاں سے اپنے ہدف پر لا رہے ہیں جہاں سے ان کو کسی خطرے کا سان گمان بھی نہیں ہے۔ ہم نے ان کو جو ڈھیل دی ہے اس کو یہ اپنی جیت سمجھے ہیں حالانکہ یہی ڈھیل ان کی ہلاکت کا پھندا ہے۔ ہم نے یہ ڈھیل اس لیے دی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے، مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اس نے بازی مار لی حالانکہ شکاری اس لیے اس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے لیکن وہ اس کے قابو سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس کی بھاگ دوڑ اس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی بلکہ اس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود گھسٹتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔ اس کی تدبیر نہایت محکم اور اس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں اتنے ہی اپنی ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو اس کو جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔

'اِسْتَدْرَجَہ' کے معنی ہیں دناہ من درجۃ الی درجۃ، خدعہ' اس کو آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ چڑھا لایا، اس کو چکمہ دے دیا، یہ اللہ تعالیٰ کے فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ ہے جس میں اس کے باغی مبتلا کیے جاتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۸۴-۱۸۶)

آنحضرت صلعم پر جنون کا الزام

'صَاحِبِهِمْ' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے قریش کو اس امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ پیغمبر ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ ان کے دن رات کے ساتھی ہیں، ان کا بچپن ان کی جوانی سب انہی کے اندر اور انہی کے ساتھ گزری ہے۔ ہر دور اور ہر مرحلہ میں انھوں نے ان کو دیکھا اور آزمایا اور ہر طرح کے حالات میں ان کو جانچا اور پرکھا ہے۔ پھر آخر یہ اس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاکبازی، اپنی فکر و رائے کی

اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں گل سرسبد رہا دفعتہً وہ اب خبطی اور دیوانہ کیسے بن گیا ؟ آخر ان میں دیوانوں اور خبطیوں کی سی کون سی بات ان کو نظر آئی ؟ یہ دیوانے اور خبطی نہیں ہیں بلکہ جس طرح ایک نذیر عریاں، خطرے کے دیدبان سے اپنی قوم کو دشمن کے حملہ سے ہوشیار کرتا ہے اسی طرح یہ خدا کے نذیر مبین ہیں جو آنے والے وقت اور تم پر نازل ہونے والے عذاب سے تم کو ڈرا رہے ہیں۔ ان کے اندر تمھیں ہوشیار و بیدار کرنے کے لیے جو بے قراری و بے چینی ہے اور انھوں نے تمھارے پیچھے اپنے رات دن جو ایک کر رکھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عظیم خطرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور جو تمھیں بے بصیرتی کے سبب سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ یہ جنون نہیں بلکہ حقیقت کا سچا احساس اور اپنی قوم کی محبت کا بے پایاں جذبہ ہے جو انھیں ہلکان کیے ہوئے ہے۔ یہ تمھاری انتہائی بلادت، ناسپاسی اور سنگ دلی ہے کہ تم اس کو خبط اور جنون قرار دیتے ہو۔

یہ واضح رہے کہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مجنون کہتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ فی الواقع آپ کو کوئی مجنون سمجھتے تھے۔ آخر قریش کے ذہین لوگ اتنے کودن کیسے ہو سکتے تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پیکر متانت و رزانت کو مجنون کہیں ؟ پھر وہ کہتے تو ان کی بات کو لائق اعتنا کون مانتا ؟ اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رات دن جو اس بات کی لگن تھی کہ اپنی قوم کو اس آنے والے عذاب سے ڈرائیں جو سنت الٰہی کے بموجب، رسول کی تکذیب کی صورت میں، لازماً ان پر آ دھمکتا، یہ چیز قریش کے لیڈروں کو بہت عجیب معلوم ہوتی، ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آخر ان پر عذاب کدھر سے آ جائے گا اور کیوں آ جائے گا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے صاحب کردار شخص کا اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر، رات دن ان کو اس عذاب سے ڈرانا اور اس جزم و یقین کے ساتھ ڈرانا کہ گویا آنے والے طوفان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، ایسی صورتِ حال نہیں تھی جس کو قریش کے لیڈر نظر انداز کر سکیں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی کوئی توجیہ تلاش کریں۔ اس کی کوئی توجیہ تلاش کرنا یا گھڑنا ان کی سیاسی مصلحت کا بھی تقاضا تھا اس لیے کہ ان کے اندر جو لوگ خالی الذہن تھے، کسی پندار یا کسی خود غرضی میں مبتلا نہ تھے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے لوثی اور دردمندی سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کو اس اثر سے بچانے اور اپنی سیادت کی دھاک قائم رکھنے کے لیے انھوں نے یہ اشغلا چھوڑا کہ جس طرح بھلے چنگے آدمی کو بھی بسا اوقات کسی چیز کا خبط اور سودا ہو جایا کرتا ہے، رات دن اس پر وہی دھن سوار رہتی اور اٹھتے بیٹھتے ہر جگہ اسے وہی چیز نظر آتی ہے اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی نعوذ باللہ عذاب اور قیامت کا سودا لاحق ہو گیا ہے، ان کی یہ چیز پروا کرنے کی نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں قریش کی اسی طفل تسلی کی تردید کی ہے کہ جس شخص کو تم مدت العمر کے تجربہ سے جانتے ہو کہ توازن فکر و عمل اور اعتدال ذہن و مزاج کے اعتبار سے تمھاری پوری قوم میں کوئی اس کا

ثانی نہ ہوا آج تم اس کو خبطی اور دیوانہ قرار دیتے ہو جب وہ سن وسال اور رشد وکمال دونوں کی پختگی کا ایک پیکر قدسی ہے۔ نادانو، یہ دیوانہ نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا اور ڈرانے والا ہے جو آنے والے طوفان کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ تو ع

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

پیغمبر کی تائید میں آفاق کی شہادت

'اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ' مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ انھیں جو عذاب اور قیامت سے ڈرا رہا ہے وہ دیوانہ اور خبطی نہیں ہے بلکہ یہ خود اندھے اور بہرے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی صدا اس کائنات کے گوشے گوشے سے اٹھ رہی ہے۔ جو شخص بھی اس کائنات کے نظام پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ کائنات عبث اور بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ یہ لازماً ایک روزِ جزا و سزا پر منتہی ہونے والی ہے جس میں فلاح صرف وہی لوگ پائیں گے جو راستی و پاکبازی کی زندگی بسر کریں گے، جو لوگ اس راہ سے ہٹ کر چلیں گے وہ جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ یہ اس مجموعی نظامِ کائنات کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف وہی لوگ جھٹلا سکتے ہیں جو عقل و شعور کے کان اور آنکھ بند کیے بیٹھے ہوں۔ پھر اس مجموعی کائنات کا ایک ایک جزو بھی اسی حقیقت نفس الامری کی شہادت پکار پکار کر دے رہا ہے۔ خدا نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ اس کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کا مظہر ہے اور اس نے اس کے لیے ایک مدت بھی ٹھہرائی ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ جس حکیم و قدیر ذات کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے وہ اس دنیا کو یوں ہی چھوڑے رکھے، اس کے خیر و شر میں کوئی امتیاز نہ کرے اور جس نے ہر چیز کے لیے ایک اجل معین کی وہ اس مجموعی دنیا اور اس کی قوموں کے لیے کوئی اجل معین نہ کرے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ آسمان و زمین کے نظام میں غور جس نتیجہ تک آدمی کو پہنچاتا ہے اس کے ایک حصہ کو، جو واضح ہے، یہاں حذف کر دیا ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ "کیا انھوں نے آسمان و زمین کے نظام اور اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں غور نہیں کیا کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا"۔ بعض جگہ اس محذوف کو واضح کر دیا ہے۔ مثلاً وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۱ - آل عمران) (اور وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا، تو پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو)

'وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ' یہ اسی محذوف پر عطف ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ یعنی اگر یہ آسمان و زمین کے نظام اور مخلوقاتِ الٰہی کی حکمتوں پر غور کرتے تو ان پر اس کائنات کا با مقصد اور ایک اجل معین کے لیے ہونا بھی واضح ہو جاتا اور ان پر یہ بات بھی کھل جاتی کہ کیا عجب کہ

اب ان کی وہ اجل بھی قریب آ گئی ہو، جس سے پیغمبر ان کو ہوشیار کر رہے ہیں اس لیے کہ جب اس دنیا کو خدا نے کھیل تماشہ نہیں بنایا ہے تو آخر وہ ان کو شترِ بے مہار کی طرح کیوں چھوڑے رکھے گا، جس طرح دوسری قوموں کو، جن کی تاریخ اوپر بیان ہوئی، اللہ نے پکڑا اب انھیں بھی پکڑ لے تو کیا بعید ہے! ـــ یہ گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں آفاقی شہادت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کو خبط پر محمول نہ کرو بلکہ اپنی بلادت اور سرگشتگی پر ماتم کرو۔

وقت گزر جانے کے بعد ایمان بے فائدہ ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ، 'بَعۡدَہٗ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں دو قول ہو سکتے ہیں، ایک اجل، جس کا ذکر اوپر گزرا، اور دوسرے قرآن جس کی آیات کی تکذیب کا یہ سارا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے۔ استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان دوسرے قول کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن میرا رجحان غالب پہلے قول کی طرف ہے کہ جب وہ اجل آ دھمکے گی تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے۔ ایمان لانے کا وقت تو اب ہے لیکن یہ منتظر ہیں کہ پیغمبر جس انجام کی دھمکی سنا رہے ہیں اس کو دیکھ لیں گے تب ایمان لائیں گے لیکن ان بدبختوں سے کوئی پوچھے کہ پھر ایمان لانے کے لیے کون سی بات باقی رہ جائے گی جس پر وہ ایمان لائیں گے؟ پھر تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا، جھگڑا جس چیز کے ماننے نہ ماننے کا ہے وہ تو اسی وقت تک ہے جب تک اس کا ظہور نہیں ہوتا، جب وہ ظاہر ہو گئی تو مانا تو کیا، انکار کیا تو کیا۔ پھر تو نتیجہ بھگتنا ہے نہ کہ کوئی چیز ماننے کے لیے باقی رہ جائے گی جس پر ان سے ایمان لانے کے لیے کہا جائے گا۔

'مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ الایۃ' اوپر والا ٹکڑا، جیسا کہ واضح ہے، حسرت کے انداز میں ہے۔ اسی مضمون کی یہ تاکید مزید ہے کہ جن لوگوں کی سمجھ میں اتنی واضح بات نہیں آ رہی ہے درحقیقت وہ سنت الٰہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں اور جو لوگ سنت الٰہی کی زد میں آ چکے ہوں ان کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ ایسے لوگ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرۡسٰہَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُہَا عِنۡدَ رَبِّیۡ ۚ لَا یُجَلِّیۡہَا لِوَقۡتِہَاۤ اِلَّا ہُوَ ؕۘ ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ لَا تَاۡتِیۡکُمۡ اِلَّا بَغۡتَۃً ؕ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنۡہَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُہَا عِنۡدَ اللّٰہِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (۱۸۷)

سوال بطور استہزاء

'یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرۡسٰہَا' سوال، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، مذاق اور استہزا کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اسی نوعیت کا سوال مراد ہے۔ 'ساعۃ' کے معنی وقت اور گھڑی کے ہیں، یہاں مراد اس عذاب اور قیامت کی گھڑی ہے جس کے دفعتہً آ دھمکنے کا ڈراوا ان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنا رہے تھے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کو دو عذابوں سے ڈراتا ہے۔ ایک اس عذاب سے جو اسی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے، اگر اس کی قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے، دوسرے اس عذاب سے جس سے کفار قیامت میں دوچار ہوں گے۔ 'السَّاعَۃ' کا لفظ دونوں ہی پر حاوی

ہے اس لیے کہ پیغمبروں کو جھٹلانے والے ان دونوں ہی کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ 'ایان' وقت سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے جس طرح 'متیٰ' آتا ہے۔ لیکن یہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز سے متعلق استغراب واستنکار کے لب ولہجہ میں سوال کیا جائے۔ 'مُرْسٰی' جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں (مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا) مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے استہزاء اور طنز کے انداز میں سوال کرتے ہیں کہ اس عذاب یا قیامت کی گھڑی کب نمودار ہوگی جس کے اتنے دنوں سے ڈراوے سنا رہے ہو، آخر یہ جہاز چلا تو کہاں اٹک کے رہ گیا، یہ ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا۔

'قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ' فرمایا کہ کہہ دو کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا، نہ مجھے اس کے وقت کا پتہ ہے اور نہ میں اس کے لا سکنے پر قادر ہوں۔

ایک اعلیٰ تلمیح

'ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' اس کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ یہ آسمان وزمین میں ایک بھاری حادثہ ہوگا۔ اگرچہ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اسلوب بیان ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ وہ گھڑی آسمان وزمین میں ایک بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف ایک تلمیح ہے کہ جس طرح ایک حاملہ عورت، ولادت کے قریب بارِ حمل سے گرانبار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان وزمین میں غور کرنے والے ارباب بصیرت کا ہے وہ آسمانوں اور زمین کو اس بوجھ سے گرانبار دیکھتے ہیں اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس بوجھ سے کب سبکدوش ہوں گے لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لیے منتظر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان وزمین کے اندر نمایاں ہے۔ اس میں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آسمان وزمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آرہی ہیں ان کو گویا آخری مرحلے میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آرہا ہے۔ 'لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً' یعنی اس کے علامات وآثار دیکھو اور انہی کو دیکھ کر اس کے آنے کا یقین کرو اور اس کے لیے تیاری کرو، اس کا ظہور جب بھی ہوگا، اچانک ہوگا، اس کے صحیح وقت کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے وقت کے نہ جاننے سے اس کے واقع ہونے کی نفی نہیں ہو جاتی۔ ایک حاملہ کے متعلق ہر شخص یقین رکھتا ہے کہ وہ جنے گی اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس وقت جنے گی۔

حفی کا مفہوم

'يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا' 'حفی' اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شخص یا کسی چیز کی کھوج کرید، دریافت، جستجو اور اہتمام کے درپے رہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تم سے اس گھڑی کے وقت کے ظہور کے متعلق اس طرح سوال کر رہے ہیں گویا تم رات دن اسی کے وقت ہی کی دریافت کے درپے رہتے ہو اور تم نے

منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ ساری معلومات اس کے متعلق جمع کر رکھی ہیں حالانکہ کوئی عاقل نہ کسی ایسی جستجو کے درپے ہوتا نہ اس کو ہونا چاہیے جو اس کے حدودِ علم و تحقیق سے ماورا ہو۔

انسان کی عجیب بدبختی

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ کیا چیز ان کے جاننے کی ہے جس کے انھیں درپے ہونا چاہیے اور کیا چیز ان کے حدودِ علم سے ماورا ہے جس کے پیچھے پڑنا محض اوقات کی اضاعت اور اپنے آپ کو فتنوں میں مبتلا کرنا ہے۔ انسان کی یہ عجیب بدبختی ہے کہ وہ زیادہ تر ان چیزوں کے پیچھے پڑتا ہے جن کو نہ تو وہ جان سکتا ہے نہ وہ اس کے جاننے کی ہیں اور پھر ان کو بہانہ بنا کر ان حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے جن کو جاننا اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ متشابہات کے پیچھے پڑ کر محکمات کا انکار کرتے ہیں ان کی بھی اصلی بیماری یہی ہے۔ اس پر ہم نے آلِ عمران کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۖ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۸۸)

پیغمبر غیب کا عالم نہیں ہوتا

یعنی ان کو بتا دو کہ میں جو اللہ کا رسول ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں سارے غیب کا عالم ہو گیا ہوں اور مجھے اس بات کا اختیار مل گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو جس نفع سے چاہوں بہرہ ور کر لوں اور جس نقصان سے بچانا چاہوں بچا لوں۔ غیب کا عالم اور حقیقی نافع و ضار صرف اللہ ہی ہے۔ دوسروں کی طرح میرے معاملات میں بھی اصلی کارفرما خدا کی مشیت ہی ہے۔ میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے نہ کہ خدائی کا تو مجھ سے ان چیزوں کا مطالبہ نہ کرو جن کا تعلق صرف خدا کے ارادے اور اختیار میں ہے۔ مجھے وحی عطا ہوئی ہے، علمِ غیب کی کنجیاں مجھے نہیں ملی ہیں۔ اگر مجھے غیب کا علم مل گیا ہوتا تو میں خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند بھی نہ پہنچ پاتا لیکن تم دیکھتے ہو کہ مجھے مختلف قسم کے گزند بھی پہنچتے ہیں اور خیر کی راہوں میں بھی میری سبقت اسی حد تک ہے جس حد تک مجھے رب کی مرضیات کا علم ہے۔ 'لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ' کے ٹکڑے میں جس خیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کر لینے کی تمنا کا اظہار ہے وہ پیغمبر کے ظرف اور اس کی طلب کے اعتبار سے ہے۔ پیغمبر اپنے حوصلہ اور اپنے ارمان کے اعتبار سے اس مقامِ بلند پر ہوتا ہے کہ وہ خیر کی کسی وادی کو ناطے کردہ نہیں چھوڑنا چاہتا لیکن وہ خیر سے واقف اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک اس کو وحیِ الٰہی کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کو پورا غیب معلوم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے اپنے امکان کے حد تک تو اس کی کوشش یہی ہو گی کہ خیر کی راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ لیکن دائرہ وحی سے باہر اسے بھی دوسروں کی طرح اپنی صواب دید ہی پر کام کرنا اور اپنی عقل ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی دونوں کے امکانات مضمر ہوتے ہیں۔

'اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ میں نہ

عالم الغیب ہوں نہ صاحبِ اختیارِ مطلق۔ میں تو صرف ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ میرے اختیار میں یہ بھی نہیں ہے کہ کسی کے دل میں ایمان اتار دوں، یہ چیز بھی لوگوں کے اپنے ارادے اور اللہ کی توفیق بخشی ہی پر منحصر ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا ۚ فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۱۸۹-۱۹۰)

اضداد کی باہمی سازگاری توحید کی دلیل ہے

'هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا' اس ٹکڑے کے مضمرات پر ہم سورۂ نساء آیت ۱ کے تحت بحث کر آئے ہیں۔ یہاں 'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ مرد اور عورت کا باہمی تعلق کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی فطری مناسبت تو نہ ہو، محض اتفاق سے وہ ایک دوسرے کے لیے سازگار، ہم جنس، سرمایۂ تسکین، راحت جان و دل اور ذریعۂ اولاد و احفاد بن گئے ہوں بلکہ سورج کی طرح یہ چیز روشن نظر آتی ہے کہ خالقِ کائنات نے مرد کے اندر عورت کے لیے اضطراب اور تڑپ پیدا کی ہے اور پھر اس کے اس اضطراب اور اس کی اس تڑپ کی تسکین ہی کے لیے اسی کی جنس سے عورت کو وجود بخشا ہے۔ ان دونوں میں ان کے فطری داعیات اور ان کی داخلی اور خارجی ساخت کے اعتبار سے ایسی گہری سازگاری ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی نہیں یہ کہہ سکتا کہ یہ سازگاری کسی اندھے بہرے مادے کی پیدا کردہ ہے یا یہ کہ ان کا ارتقا آپ سے آپ خودرو درختوں کی طرح ہوا پھر دونوں اپنے اپنے طور پر بھٹکتے ہوئے کہیں راستے میں مل گئے تو اچانک تڑپ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے اور پھر اس طرح باہم دگر جان و تن بن گئے۔ ؏

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

پھر یہ سازگاری، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس حقیقت کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک ہی حکیم و علیم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر اس میں مختلف ارادے کارفرما ہوتے تو اس کے اضداد کے اندر وہ سازگاری کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں متضاد خصوصیات سے متصف ہیں لیکن مدبرِ کائنات نے ان دونوں کے درمیان اس طرح جوڑ ملایا ہے کہ ایک نے درد اور دوسری نے دوا کی شکل اختیار کر لی ہے۔

سائنس کا ایک انکشاف

'جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا' پر غور کرتے ہوئے جدید سائنس کے اس انکشاف کو بھی ذہن میں رکھیے کہ زندگی کے آغاز میں جسدِ انسان کی اولین صورت ایک جونک کی طرح ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھی اور ایک خلیہ کے جاندار کے توالد کا طریق یہ ہے کہ وہ بڑھ کر خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جن میں سے ہر ایک حصہ ایک مکمل جاندار ہوتا ہے۔ پھر بتدریج ارتقا کے اگلے مراحل پر ایک حصہ مادہ کے فرائض کے لیے اور دوسرا حصہ

نر کے فرائض کے لیے موزوں بن جاتا ہے۔[1]

ایک عام انسانی کمزوری کا بیان

فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ۔ آیات ۱۲۴۔ ۱۲۵ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ تصویرِ حال کے مواقع میں 'لَمَّا'، 'كُلَّمَا' اور 'اِذَا' کی جگہ پر بھی استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے یہاں کسی خاص شخص کا حال یا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ عام انسانوں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ باوجودیکہ مرد اور عورت دونوں کو خدا ہی نے بنایا اور ان کی باہمی سازگاری دلیل ہے کہ ایک خدا کے سوا ان کے بنانے میں کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے لیکن انسان کی یہ عجیب خرد باختگی ہے کہ جب اولاد پیدا ہونے والی ہوتی ہے تب تو میاں بیوی دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بھلی چنگی اولاد عطا فرما لیکن جب اللہ ان کو بھلی چنگی اولاد دے دیتا ہے تو اس کو منسوب کسی درگاہ و خانقاہ اور کسی بزرگ یا کسی بت کی طرف کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں کی توجہ اور فلاں کی برکت و عنایت کا کرشمہ ہے۔ بعض لوگوں نے 'لَمَّا' کی وجہ سے اس کو ایک معیّن واقعہ سمجھا اور جب معین واقع سمجھا تو ضروری ہوا کہ اس کو کسی خاص شخص کی طرف منسوب کریں چنانچہ انھوں نے اس کو حضرت آدمؑ اور حوا کی طرف نسبت دے دی اور اس کے لیے ایک بے بنیاد واقعہ بھی گھڑ کر تفسیروں میں شامل کر دیا حالانکہ قطع نظر اس سے کہ حضرت آدمؑ پیغمبر ہیں، اس جعلی روایت کی تردید کے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہ بات یہاں اس عہدِ فطرت کی خلاف ورزی کی مثال کے طور پر بیان ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۷۲ میں گزرا۔ ظاہر ہے کہ اس عہد میں تمام نسلِ انسانی کے باپ کی حیثیت سے حضرت آدمؑ سب سے پہلے شریک ہیں تو نعوذ باللہ اگر وہی اس عہد میں بودے ثابت ہو جاتے تو پھر دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ 'صالح' کا لفظ عربی میں بھلے چنگے، تندرست، ذی صلاحیت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت پوری طرح بوجھل ہو جاتی ہے اور وضعِ حمل کا وقت قریب آتا ہے تو بیوی اور میاں دونوں پر ایک اندیشے کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس اندیشہ میں وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور چونکہ اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا نقش ہے، کسی اور کا نقش نہیں ہے اس وجہ سے یہ توجہ خدا کی طرف بلاشرکتِ غیرے ہوتی ہے۔ وہ اسی سے دعا کرتے ہیں کہ خدا بھلی چنگی، تندرست و خوب صورت اور ذی صلاحیت اولاد بخشے لیکن جب خدا اولاد دے دیتا ہے تو نہ جانے کن کن کو وہ اس میں شریک بنا بیٹھتے ہیں۔

قرآن میں انسانی فطرت کا یہ خاص پہلو جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ انسان اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اس کو دوسرے

---

[1] یہ بات محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کی کتاب 'قرآن اور علم جدید' میں میری نظر سے گزری تھی۔ میں خود بدقسمتی سے سائنس کا کبھی طالب علم نہیں رہا۔

اسباب و وسائل کا کرشمہ قرار دینے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا تجربہ ہر شخص خود اپنے اندر کر سکتا ہے۔ انسان کی عام حالت یہی ہے اور یہاں عام حالت ہی بیان ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے بلید بھی پائے جاتے ہوں جو کسی حال میں بھی خدا کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں لیکن فرعون تک کا حال قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ڈوبتے وقت اسے بھی خدا یاد آیا۔ بہرحال مستثنیات سے یہ کلیہ ٹوٹ نہیں جاتا۔ آدمی پر جب حقیقی افتقار کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ دل دل میں یا زبان اور دل دونوں ہی سے خدا کو پکارتا ہے اور یہ عہد بھی کرتا ہے کہ اگر اس مرحلہ یا اس بھنور سے وہ گزر گیا تو آئندہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے گا لیکن جونہی اس مرحلہ سے گزر جاتا ہے، وہ یہ سارا عہد و پیمان بھلا کر انہی خود فراموشیوں میں پھر گم ہو جاتا ہے جن میں پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتابوں میں سے 'حقیقت شرک' اور 'حقیقت توحید' میں بھی بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔

نظم کے پہلو سے یہ آیات اس مضمون سے تعلق رکھتی ہیں جو اوپر ۱۷۲ - ۱۷۴ میں عہد فطرت کا بیان ہوا ہے۔ بیچ میں کچھ آیتیں تنبیہ و تذکیر اور انذار کی نوعیت کی آگئی ہیں۔ اب یہ پھر اسی مضمون کو لے لیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ انسان کی فطرت کی اصل صدا کیا ہے اور انسان (یہاں خاص اشارہ قریش کی طرف ہے) اپنی فطرت کی اس صدا سے کان بند کر کے کس طرح مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

'فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفات کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ ملانا جو اس کی بنیادی صفات کو باطل کر دیں بالکل خلاف عقل ہے، شرک، جس نوعیت کا بھی ہو، تمام صفات کمال کی نفی کر دیتا ہے اس وجہ سے خدا ایسی تمام نسبتوں اور شرکتوں سے منزہ اور ارفع ہے۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۱ - ۱۹۲)

یہ 'تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ' کے مضمون کی وضاحت ہے کہ خدا ہی سب کا خالق اور سب کا مالک ہے تو ان چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنانے کا کیا تک ہے جو کسی چیز کو بھی خلق نہیں کرتی ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں اور جو نہ تو ان کی کوئی مدد کر سکنے پر قادر ہیں اور نہ اپنی ہی کوئی مدد کر سکتی ہیں؟

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۹۳ - ۱۹۴)

مشرکوں کو چیلنج

'اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ' مطلب یہ ہے کہ معبود سے عابد کی سب سے بڑی احتیاج تو یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں رہنمائی فرماتا ہے لیکن تم جن معبودوں کو پوجتے ہو اگر تم ان کو زندگی کے کسی موڑ پر پکارو کہ وہ تمہاری رہنمائی کریں تو نہ وہ سنیں گے اور نہ تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے ساتھ لگیں گے۔ لفظ 'اتباع' یہاں اپنے ابتدائی لغوی مفہوم میں ہوگا۔ 'اتبع' مشی خلفہ۔ مضی معہ، لحقہ۔

اس کے پیچھے چلا، اس کے ساتھ ہو لیا، اس کو جا پہنچا۔ آگے اس مضمون کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ، وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے۔ تم خیال کرتے ہو کہ وہ تمھیں دیکھ رہے ہیں حالانکہ انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے)۔ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ یعنی رووٴ، چیخو، فریاد کرو یا خاموش رہو، ان کے لیے دونوں یکساں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ الاٰيۃ یعنی یہ خود تمھاری ہی طرح خدا کی مخلوق ہیں تو یہ تمھاری مدد یا رہنمائی کیا کر سکتے ہیں اور اگر تمھارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ تمھاری مدد اور رہنمائی کر سکتے ہیں تو ان کو پکارو، یہ تمھاری مدد کریں۔ یہ مشرکین کو اسی طرح کا چیلنج ہے جس طرح کا چیلنج وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ ۲۳) (اور بلالو اپنے شریکوں کو بھی جن کو تم اللہ کے سوا مانتے ہو، اگر تم سچے ہو) میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اب تک تو تم نے اپنے ان خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا لیکن اب پیغمبر اور قرآن نے ان سب کی خدائی کو چیلنج کر دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمھاری مدد اور رہنمائی کے لیے پہنچیں اور تم کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی سنبھالیں۔ اگر انھوں نے اپنی خدائی بچا لی تو بے شک معلوم ہوگا کہ تم سچے ہو۔ یہ بات واضح رہے کہ اہلِ عرب جن بتوں کو پوجتے تھے وہ ان کے گمان کے مطابق فرشتوں، جنات اور کواکب کے بُت تھے اس وجہ سے ان کو عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فرمایا ہے۔ تفصیل اس کی ہماری کتاب 'حقیقت شرک' میں ملاحظہ فرمائیے۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵)

بت پرستی کی تردید اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے

بت پرستی دو جزوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ذوات ہیں جن کو بت پرست اپنے زعم کے مطابق خدائی میں شریک مانتے اور ان کو الٰہ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے وہ پتھر اور سونے یا چاندی کی مورتیں ہیں جن کو وہ ان ذوات کے پیکر اور قالب کی حیثیت سے ڈھالتے یا تراشتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان مظاہر کے اندر ان کے مزعومہ دیوتا حلول کر جاتے ہیں اور ان مظاہر کی پرستش ان آلہہ کی پرستش کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔ نظریہ کے اعتبار سے تو بت پرستی کے حامی اس کی حمایت میں یہی بات کہتے ہیں لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ عوام کالانعام سب کچھ ان مورتوں ہی کو سمجھتے ہیں جن کے آگے وہ ڈنڈوت کرتے اور نذر و قربانی پیش کرتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بت پرستی کی اس کے دونوں ہی پہلو سامنے رکھ کر تردید کی ہے۔ اوپر کی آیات میں ذوات کو پیش نظر رکھ کر تردید فرمائی، اب یہ ان کے مظاہر کو پیش نظر رکھ کر اس کی تردید ہو رہی ہے کہ دیکھ لو ان کے جو ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ تم نے بنائے ہیں سب نمائشی اور دکھاوے کے ہیں، یہ اپنے چہرے سے مکھی بھی نہیں ہٹا سکتے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے دودھ اور حلوے کی بھی کتوں اور بلیوں سے حفاظت نہیں کر سکتے تو یہ بھلا تمھاری کیا مدد کر سکیں گے جو تم نے ان کو اپنا ملجا و ماویٰ اور ولی و کارساز بنا یا ہے۔

بعینہٖ یہی حقیقت زبور میں بدیں الفاظ واضح فرمائی گئی ہے۔

ان کے بت چاندی اور سونا ہیں۔
یعنی آدمی کی دستکاری۔
ان کے منہ ہیں، پر وہ بولتے نہیں۔
آنکھیں ہیں، پر وہ دیکھتے نہیں۔
ان کے کان ہیں، پر وہ سنتے نہیں۔
ناک ہیں، پر وہ سونگھتے نہیں۔
ان کے ہاتھ ہیں، پر وہ چھوتے نہیں۔
پاؤں ہیں، پر وہ چلتے نہیں۔
اور ان کے گلے سے آواز نہیں نکلتی۔
ان کے بنانے والے انھیں کے مانند ہو جائیں گے۔
بلکہ وہ سب جو ان پر بھروسہ رکھتے ہیں۔
زبور باب ۱۱۵ : ۴-۸

'قُلِ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ' یہ مشرکین کی دھمکیوں کا جواب ہے کہ تم ان بے جان اور بے حرکت مورتوں سے مجھے ڈراتے ہو کہ ان کی مذمت و مخالفت کے نتیجہ میں ان کا غضب مجھ پر بھڑکے گا۔ اگر تم یہ گمان رکھتے ہو تو تم اپنے ان سب دیویوں دیوتاؤں کو اپنی مدد کے لیے پکارو اور میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو کر گزرو، ذرا بھی رعایت نہ برتو اور ایک دن کے لیے بھی مجھے مہلت نہ دو۔

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۱۹۶ - ۱۹۸)

اللہ تعالیٰ کی شان

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الاٰیۃ۔ 'وَلِیّ' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، حامی و ناصر اور مرجع و کارساز کے آتے ہیں۔ اوپر آیات ۱۹۲-۱۹۳ میں گزر چکا ہے کہ یہ بت جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں ان کی تو کیا مدد کریں گے خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور اگر یہ ان کو مدد و نصرت اور حمایت و ہدایت کے لیے پکاریں تو ان کا پکارنا اور نہ پکارنا دونوں یکساں ہے، وہ ان کی مدد و رہنمائی کے لیے کبھی نہیں پہنچیں گے۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی شان بیان ہو رہی ہے کہ میرا حامی و ناصر وہ اللہ ہے جس نے میری اور خلق کی ہدایت کے لیے نہایت اہتمام کے ساتھ کتاب اتاری ہے اور جو اپنے نیکوکار اور صالح بندوں کو دوست رکھتا اور ہر مرحلہ میں ان کی مدد اور رہنمائی فرماتا ہے۔ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'نَزَّلَ' میں اہتمام کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی اس نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے بندوں

کی رہنمائی کے لیے کتاب اتاری ہے۔ یوں تو بندہ ہر چیز کے لیے اپنے رب ہی کا محتاج ہے لیکن اس کی سب سے بڑی احتیاج ہدایت کے لیے ہے جس کا اہتمام خدا ہی نے فرمایا ہے تو آخر یہ اصنام و آلہہ کس مرض کی دوا ہیں اور کس احتیاج کے لیے ان کی پوجا ہو رہی ہے۔

'وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ الاية' یہ اوپر آیت ۱۹۲ کا مضمون کسی قدر اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اعجازِ بیان کی ایک مثال

'وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا' یہ اوپر آیت ۱۹۲ کے مضمون کی وضاحت ہے یہاں 'لَا يَسْمَعُوْا' کا لفظ 'لَا يَتَّبِعُوْكُمْ' کے صحیح مفہوم پر روشنی ڈال رہا ہے۔ 'وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ' اس ٹکڑے میں 'رویت'، 'نظر' اور 'ابصار' کے الفاظ اس خوبی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بس قرآن کا اعجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے بصرو، تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ تمھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں سوجھتا سمجھاتا کچھ بھی نہیں۔

'تَرٰىهُمْ' میں واحد کا خطاب، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، جمع کے مفہوم میں ہے اور مخاطب مشرکین ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (۱۹۹-۲۰۲)

پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو بعض ہدایات

'خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ'۔ اب یہ سورہ کے آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے مسلمانوں کو بعض مناسبِ وقت ہدایات دی گئی ہیں۔ لفظ 'عفو' جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے، اس طرح کے سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو دل سے معاف کر دینے کے معنی میں نہیں بلکہ مجرد درگزر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ 'عُرْف' ایسی بات کو کہتے ہیں جو عقل اور فطرت اور معقول لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہو۔ یہاں اس سے مراد توحید و معاد اور نیکی و عدل کی وہی باتیں ہیں جن کی اس دور میں اہلِ عرب کو دعوت دی جا رہی تھی اور جو یکسر عقل و فطرت کی شہادت پر مبنی اور سلیم الفطرت طبائع کے لیے ان کے دل کی آواز تھیں۔ فرمایا کہ تم توحید اور معاد، نیکی اور عدل کی جو دعوت دے رہے ہو اس پر جمے رہو اور ان جاہلوں کی ژاژ خائیوں سے ابھی درگزر کرو۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ اپنی ان بوالفضولیوں کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے۔

'وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ الاية' 'نَزْغ' کے معنی چرکا لگانا، کچوکا لگانا، زخم پہنچانا۔ یہ تدبیر بیان ہوئی ہے روشِ عفو پر قائم رہنے اور جاہلوں کی روش سے اعراض اور ان کے کچوکوں اور طعنوں کے صدمات سے اپنے دل کو محفوظ رکھنے کی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شیاطین جن و انس کی ہرزہ سرائیوں اور خاکبازیوں سے دل کو کوئی صدمہ پہنچے تو اپنے رب کی پناہ ڈھونڈو۔ تمھارا رب سمیع و علیم ہے، تم جب بھی اس کی طرف رجوع کرتے ہو وہ تمھاری دعائیں اور فریادیں سنتا، تمھارے حالات اور پریشانیوں کو جانتا

ہے اور شیاطین کی فتنہ انگیزیوں اور چیرہ دستیوں سے بھی وہ اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ تمھارے ہر غم کو دور فرمائے گا۔

'اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا' اور 'خُذِ الْعَفْوَ' میں خطاب اگرچہ لفظاً واحد سے ہے لیکن یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے چنانچہ اس آیت میں جمع کے اسلوب نے اس مخفی حقیقت کو واضح کر دیا۔ فرمایا کہ جو لوگ جہالت کے بجائے تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں جب کبھی ان کو جاہلوں کی جہالت اور شیاطین کی شیطنت کا کوئی جھٹکا لگتا ہے تو وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جس سے فوراً ان کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اشرار و معاندین کی ساری خاکبازی کے باوجود ان کی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ یہ گویا اس 'استعاذہ' کا طریقہ اور فائدہ بتا دیا گیا جس کی اوپر والی آیت میں ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو یاد کرے۔ یہ چیز دل کے اندر ایسی بصیرت اور ایسی قوت و ہمت پیدا کر دے گی کہ دفعتہً آنکھوں کے آگے کا سارا غبار چھٹ جائے گا۔

'وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ'۔ 'هُمْ' کا مرجع وہ 'جاہلین' ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۱۹۹ میں گزرا۔ 'اخوان' سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جن کے ہاتھوں میں ان کی باگ ہے، عام اس سے کہ وہ شیاطین انس میں سے ہوں یا شیاطین جن میں سے۔ فرمایا کہ اہل ایمان کو تو خدا کی یاد سنبھال لیتی ہے لیکن جاہلین کو ان کے شیاطین گمراہی کی وادیوں میں بھٹکاتے بھٹکاتے آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں، ذرا بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے کہ بازگشت کا کوئی امکان باقی رہے۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (۲۰۳-۲۰۴)

شیطانی طعنے اور ان کا مقابلہ

یہ ان شیطانی طعنوں اور نزغات کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن سے کفار کے ہاتھوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت سابقہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم ان کے مطالبہ پر ان کے انتخاب کے مطابق معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ تمھیں طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کہیں سے کیوں نہیں چھانٹ لائے؟ اس قول سے ظالموں کا مطلب یہ ہوتا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو بہت آسان ہے۔ ادھر اُدھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور کاہنوں اور اہل کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں ان میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں ان کو جوڑ جاڑ کر کچھ کلام بنایا اور اس کو لا کر ہمیں اس دعوے کے ساتھ سنا دیا کہ یہ اللہ نے اپنے خاص فرشتے کے ذریعہ سے وحی بھیجی ہے لیکن اب ہم نے مطالبہ جو معجزے کا رکھ دیا ہے تو تمھاری کچھ پیش نہیں جاتی اس لیے کہ ادھر اُدھر سے باتیں چھانٹ لینا اور چیز ہے، معجزہ دکھانا اور چیز ہے۔ یہ چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ کر لاتے اور ہمیں دکھا دیتے کہ یہ لو، تمھارا مطالبہ

پورا کر دیا۔ گویا اس طعنہ میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے ہی کا طعنہ نہیں بلکہ اس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اس کے اندر یہ مضمر ہے کہ نعوذ باللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو ادھر ادھر سے اپنے ذوق کے مطابق چھانٹی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔

'اِجْتِبَاء' کا اصل لغوی مفہوم تو مجموعہ میں سے کسی چیز کو انتخاب کر لینا اور چھانٹ لینا ہے لیکن جب طنز کے سیاق و سباق میں یہ لفظ استعمال ہو، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی گھڑنے اور بنا لینے کے ہو جائیں گے اسی وجہ سے فرّاء نے اس کی تفسیر 'اِخْتَلَقْتَهَا اِفْتَرَيْتَهَا' سے کی ہے اور یہ تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ طنزیہ اسلوب میں الفاظ کے مفہوم بدل جایا کرتے ہیں۔

طنز کا باوقار اور بھرپور جواب

'قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰىٓ اِلَيَّ الاية' یہ پیغمبر کی طرف سے کفار کے مذکورہ بالا طنز کا جواب ہے اور دیکھیے کیسا باوقار اور بھرپور جواب ہے۔ فرمایا کہ کہہ دو تم جو چاہو سمجھو اور جو چاہو کہو، میں تو بس اسی وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو میرے اوپر میرے رب کی جانب سے آتی ہے۔ اوپر جاہلوں کی جہالت سے اعراض کی جو ہدایت ہوئی تھی، یہ جواب اس ہدایت کی تعمیل کی بہترین مثال ہے۔ ان کی جاہلانہ بات کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا، صرف اصل حقیقت نہایت سادہ مگر نہایت باعظمت اسلوب میں ظاہر فرما دی 'هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ' یعنی تم اس چیز کو میری گھڑی ہوئی چیز کہتے ہو لیکن یہ تمہارے رب کی جانب سے آنکھوں اور دلوں کے پردے اٹھا دینے والی آیتیں اور تمہارے لیے ہدایت و رحمت ہیں۔ ہدایت اپنے آغاز کے اعتبار سے اور رحمت اپنے انجام کے لحاظ سے۔ لیکن یہ ان کے لیے نافع ہیں جو ایمان لائیں۔ 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ' میں یہ لطیف تلمیح بھی مضمر ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اصل خرابی تمہارے اپنے دلوں کے اندر ہے کہ تم حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

قرآن سے مستفید ہونے کا طریقہ

'وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ الاية' اب یہ بتایا ہے کہ قرآن کی ہدایت و بصیرت سے مستفید ہونے کا طریقہ کیا ہے، فرمایا کہ جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموشی سے اس پر کان لگاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو رحمت الٰہی تمہاری طرف متوجہ ہو گی اور اس پر ایمان لانے کے لیے تمہارے دل کھلیں گے 'انصات' کے معنی خاموشی سے کسی کی بات سننے کے لیے کان لگانا ہے۔ اس میں کفار کے اس غلط رویہ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے قرآن کے معاملہ میں اختیار کر رکھا تھا۔ سورہ فصلت میں ہے: 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ ۲۶ فصلت' (اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اور جب سنایا جائے تو اس میں گھپلا ڈالو) فرمایا کہ یہ روش جہالت کی روش ہے جس کا نتیجہ رحمت سے محرومی ہے۔ صحیح روش اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو سنو اور شور و شغب کے بجائے خاموشی سے کان لگا کر سنو۔ یہ طریقہ اس رحمت سے مستفید ہونے کا ہے۔

اس آیت کو ہمارے فقہا کے ایک گروہ نے امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک دلیل کا بھی ماخذ بنایا

ہے۔ لیکن یہ آیت، جیسا کہ واضح ہے، اس سیاق و سباق کی آیت نہیں ہے اور اگر سیاق و سباق سے قطع نظر کر کے کوئی اس طرح کا استنباط آیت سے کرنا ہی چاہے تو بات ان لوگوں کے حق میں نہیں جاتی جو امام کے پیچھے یک قلم فاتحہ پڑھنے کے مخالف ہیں بلکہ ان لوگوں کے حق میں جاتی ہے جو جہری نمازوں میں تو فاتحہ پڑھنے سے روکتے ہیں لیکن سری میں نہیں روکتے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ (۲۰۴-۲۰۶)

وَاذْكُر رَّبَّكَ الاية' اوپر خدا کی پناہ میں آنے کا طریقہ خدا کو یاد کرنا بتایا ہے۔ اب خدا کو یاد کرنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ اس کے لیے تین باتیں ارشاد ہوئیں۔

ایک یہ کہ یہ فروتنی، مسکنت، لجاجت اور خوف کے ساتھ دل دل ہی میں ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناز، تدلل اور احساس استحقاق و استکبار اس کے منافی ہے۔

دوسری یہ کہ اگر قول سے ذکر ہو تو دون الجہر ہو یعنی بہت زیادہ بلند آواز سے نہ ہو۔ اس بات کی وضاحت سورہ بنی اسرائیل میں یوں ہوئی ہے۔ 'وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا۔ بنی اسرائیل ۔ ۱۱۰' (اور اپنی دعا نہ بہت بلند آواز سے کرو، نہ بہت پست آواز سے، ان کے درمیان کی راہ اختیار کرو) یہ ہدایت مشرکین کے طریقہ سے بچانے کے لیے بھی ہوئی اور اس لیے بھی کہ ہمارا پروردگار سمیع و علیم ہے، نعوذ باللہ بہرا نہیں ہے۔ یاد ہوگا کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا تھا۔ علاوہ ازیں اس میں ریا، شہرت اور نمائش کا بھی زیادہ امکان ہے جو اخلاص کے بالکل منافی چیزیں ہیں۔

تیسری یہ کہ اللہ کی یاد ہر وقت رہنی چاہیے۔ 'بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ' کے الفاظ، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں جس طرح ہم صبح و شام کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی میں یہ الفاظ ہیں۔ 'وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ' اسی مفہوم کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی خدا کی یاد سے کسی وقت بھی غفلت نہ ہو۔ جس طرح جسم کی زندگی کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے، اسی طرح روح کی زندگی کے لیے ذکر الٰہی ضروری ہے۔ شیطان ہر وقت حملہ کی گھات میں رہتا ہے، کسی وقت بھی اس کام سے غافل نہیں ہوتا اس وجہ سے اس سے پناہ حاصل کرنے کے لیے جو حرز ہے آدمی کو اس سے بھی کسی وقت غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ اس ذکر کی شکلیں اور صورتیں حالات، ضروریات مقتضیات اور اوقات کی تبدیلی سے بدل بدل جاتی ہیں لیکن اس سے غفلت کسی وقت بھی جائز نہیں۔ انسان جہاں غافل ہوا شیطان کسی نہ کسی راہ سے حملہ آور ہو جائے گا ——— اس امر کی یاددہانی کی یہاں ضرورت نہیں ہے کہ خطاب اگرچہ بصیغہ واحد ہے لیکن اس کی نوعیت وہی ہے جو اوپر آیت ۱۹۹ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ الایۃ" "جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں" سے اشارہ فرشتوں کی طرف ہے۔ ان کے بابت فرمایا کہ وہ خدا کی بندگی سے کسی وقت سرتابی نہیں کرتے، برابر اس کی تسبیح میں لگے رہتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ آیت ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں برابر سرگرم رہنے والوں کے زمرہ کو بتاتی ہے کہ جو لوگ خدا کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں گو وہ رہتے بستے زمین میں ہیں لیکن ان کا تعلق فرشتوں کی بزم قدس سے ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح وہ ہر وقت زمزمہ سنج تسبیح و تہلیل رہتے ہیں، یہ بھی اسی طرح مصروفِ یادِ الٰہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس میں مشرکین پر تعریض بھی ہے کہ یہ تو فرشتوں ہی کی سفارش کے بل پر اکڑتے پھرتے ہیں، نہ خدا کو خاطر میں لاتے ہیں نہ رسول کو لیکن خود فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت خدا کے آگے تسبیح و سجود میں لگے ہوئے ہیں۔

سورۂ اعراف کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو قلم بند ہوئیں۔ جو باتیں صحیح قلم سے نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نکلی ہیں۔ جو غلط نکلی ہیں وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ضرر سے مجھ کو اور اس کتاب کے پڑھنے والوں کو محفوظ رکھے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

لاہور

۲۱، شعبان ۱۳۸۸ ھ

۱۳، نومبر ۱۹۶۸ ء